QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

فقہِ حنفی و مالکی میں عرف کی حیثیت و حجیت کا تقابلی و تحقیقی مطالعہ

The Status and Legal Authority of ʿUrf in Ḥanafī and Mālikī Jurisprudence: A Comparative and Analytical Study

Muhammad Asrar
M.Phil Scholer, Department of Islamic Studies, Green International University, Lahore
asrarahmad037@gmail.com
Dr. Hafiz Falak Shair Faizi
Assistant Professor, Department of Islamic Thought and Civilization, University of Management & Technology, Sialkot Campus.
falak.shair@skt.umt.edu.pk

Abstract

The concept of ʿUrf (custom) occupies a significant position in Islamic jurisprudence as a supplementary source for deriving legal rulings, particularly in matters where explicit textual evidence is absent or requires contextual interpretation. This study presents a comparative and analytical examination of the legal authority (ḥujjiyyah) of ʿUrf in the Ḥanafī and Mālikī schools of Islamic law. It explores the definitions, classifications, evidential foundations, conditions of validity, juristic maxims, and practical applications of ʿUrf in both schools. The research further investigates the relationship between ʿUrf and other juristic principles, particularly Qiyās (analogical reasoning), highlighting the circumstances in which customary practice is preferred over analogical deduction. In addition, the study analyzes the role of ʿUrf in the specification of general legal texts, the restriction of unrestricted rulings, and the resolution of contemporary legal issues through practical examples drawn from commercial transactions, leases, wills, and family law. Employing a comparative and qualitative methodology based on classical juristic sources, the study demonstrates that both the Ḥanafī and Mālikī schools recognize valid custom as an authoritative legal proof, although they differ in the scope and methodology of its application. The findings reveal that ʿUrf serves as an essential mechanism for ensuring flexibility, facilitating legal adaptation to changing social circumstances, and preserving the objectives of Sharīʿah while maintaining fidelity to its foundational texts.

***Keywords**: ʿUrf, Custom, Islamic Jurisprudence, Ḥanafī School, Mālikī School, Legal Authority, Comparative Fiqh, Qiyās, Sharīʿah.*

فقہِ اسلامی کے ہمہ گیر نظام میں مذہب حنفی اپنی وسعتِ نظری اور حقیقت پسندی کے باعث ایک امتیازی مقام رکھتا ہے، جہاں وحی الٰہی کے ابدی اصولوں کو انسانی معاشرت کے عملی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا فن معراج پر نظر آتا ہے۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور ان کے جلیل القدر تلامذہ نے جس فقہی عمارت کی بنیاد رکھی، اس میں عرف و تعامل محض ایک ثانوی آخذ نہیں بلکہ قانون سازی کا وہ متحرک عنصر ہے جو شریعت کو ہر عہد کے تمدنی تغیرات کا ساتھ دینے کے قابل بناتا ہے۔ احناف کے نزدیک عرفِ صحیح کی حجیت اس درجے پر فائز ہے کہ وہ مخصوص حالات میں قیاسِ جلی جیسے منضبط قاعدے کو بھی ترک کرنے کی بنیاد بن جاتا ہے، کیونکہ دینِ فطرت کا منشا انسانیت کو تنگی میں ڈالنا نہیں بلکہ معروف کے ذریعے نظمِ کائنات کو استوار رکھنا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں ہم فقہِ حنفی و مالکی کے اسی حکیمانہ اسلوب کا علمی محاکمہ کریں گے کہ کس طرح صاحب مذہب اور ائمہِ ترجیح نے العرف فی الشرع لہ اعتبار کے زریں اصول کے تحت معاشرتی رواجوں کو شرعی احکام کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

حنفی فقہاء کے نزدیک شریعت کا مقصد لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے، اور یہ آسانی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب لوگوں کے درمیان رائج عرف کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ضابطہ وضع کیا: یعنی عرف اور عادت کو حکم مانا جاتا ہے۔[1]

[1] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الاشباہ والنظائر ص۔ 87۔ دمشق: دار الفکر۔ 1999۔

یہ ضابطہ فقہ حنفی کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ ذیل میں میں نے تفصیل درج کی ہے جس سے ہم کو علم ہو گا کہ حنفی فقہاء نے عرف کی کیا تعریف کی؟ اس کی کتنی اقسام ہیں؟ کن شرائط میں عرف حجت ہے؟ اور کن مقامات پر انہوں نے قیاس اور روایات کو بھی عرف کے سامنے پس پشت ڈال دیا؟۔

حنفی فقہاء نے عرف کی متعدد تعریفیں کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(ا) امام شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی رحمہ اللہ علیہ متوفی 483ھ جو "تاج الائمہ" کے لقب سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں:

عرف وہ ہے جس پر نفوس عقول کی گواہی سے مستقر ہو جائیں، اور سالم طبائع اسے قبول کر لیں۔[1]

اگر ہم اس تعریف میں غور کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ نے اس تعریف میں عرف کی دو بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں:

پہلی: یہ عقل کی گواہی سے مستقر ہو

دوسری: یہ فطرت سلیم کے مطابق ہو

امام زین الدین ابن نجیم المصری رحمہ اللہ علیہ متوفی 970ھ جو فقہ حنفی کے نامور محقق ہیں، فرماتے ہیں: عرف وہ ہے جسے لوگ باہم جانتے ہوں اور ان کا عمل اور عادت اس پر جاری ہو، خواہ وہ قولی ہو یا فعلی۔[2]

امام ابن نجیم رحمہ اللہ علیہ نے اس تعریف میں عرف کے تین عناصر بیان کیے ہیں:

1. لوگوں کا باہمی تعارف تعرّف
2. اس پر عمل کا جاری ہونا
3. عادت بن جانا

امام محمد امین ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ متوفی 1252ھ جو فقہ حنفی کے آخری کبیر المحققین ہیں، فرماتے ہیں: "عرف وہ ہے جو کثرت استعمال سے نفوس میں مستقر ہو جائے، اور احکام میں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔[3]

عرف کی حقیقت لغت میں کسی امر کے خوگر اور عادی بن جانے کے ہیں، اور اصطلاح میں عرف کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی امر بار بار کرنے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو چکا ہو اور اچھے اور نیک لوگ اس امر کو بلا تکلف اختیار کرنے لگے ہوں اور پوری قوم اس کو اختیار کرنے کی عادی بن چکی ہو۔[4]

اگر عرف کی اقسام کو ملاحظہ کیا جائے تو حنفی فقہاء نے عرف کو متعدد اعتبارات سے تقسیم کیا ہے:

1. عرف عام و عرف خاص

امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عرف دو قسم کا ہے: عام اور خاص۔ عام وہ جو اہل اسلام کی اکثریت میں جاری ہو۔ اور خاص وہ جو کسی خاص صنعت یا شہر والوں میں جاری ہو۔[5]

عرف خاص:

کسی خاص علاقے یا شہر کا عرف ہو دوسرے کا نا ہو جیسے مسجد میں قرآن پاک وقف کرنے کا عرف عام ہے اور مسجد میں ہانڈی وقف کرنا عرف خاص ہے۔ .اسی طرح بعض شہروں میں اجارہ کے سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے، جبکہ بعض شہروں میں جنوری سے ہوتا ہے، اسی طرح بعض جگہ پر جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے جب کہ بعض جگہ اتوار کو تعطیل ہوتی ہے یہ سب عرف خاص کی مثال ہے۔[6]

[1] :۔ السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔۔ المبسوط جلد 12، ص۔ 45۔ قاہرہ: دار الحدیث۔ 2019

[2] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔۔ الاشباہ والنظائر ص۔ 88۔ دمشق: دار الفکر۔ 1999

[3] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ رد المحتار علی الدر المختار جلد 1، ص۔ 45۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 2003۔

[4] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین 2/114۔ قاہرہ، مصر: المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ۔ 1905۔

[5] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ رد المحتار علی الدر المختار جلد 4، ص۔ 78۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 2003۔

[6] :۔ ایضا، مجموعۃ رسائل ابن عابدین 2/54۔ قاہرہ، مصر: المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ۔

عرف خاص کی مثالیں:

کسی خاص شہر میں مہر کی مقررہ رقم

کسی خاص پیشے میں اجرت کی متعین مقدار

عرف عام کی تعریف:

یہ وہ عرف ہے کسی معاملہ میں تمام علاقوں یا اکثر کے تمام لوگوں میں مروج ہو، عرف عام، قولی اور فعلی دونوں ہوتا ہے۔

عرف عام کی مثالیں:

کسی چیز کو خریدتے وقت صرف اشارے سے۔بیع کرنا معاطاۃ

گھر کرایہ پر دیتے وقت معمولی مرمت کرنے کا رواج

2.عرف قولی وعرف فعلی

امام نجیم رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عرف دو قسم کا ہے: قولی اور فعلی۔ قولی جیسے دابۃ کا لفظ گھوڑے پر بولنا۔ اور فعلی جیسے.بیع کو معاطاۃ کے ذریعے کرنے کا رواج۔[1]

عرف قولي:

کسی لفظ کو حقیقی معنی کے بجائے مجازی یا عرفی معنی میں استعمال کرنا۔ مثال: "دابۃ" کا لفظ عرف میں گھوڑے کے لیے بولا جاتا ہے۔

عرف فعلي:

لوگوں کا کسی کام کو مسلسل کرنے کا رواج۔ مثال: بیع میں صرف لے دے کرنا، الفاظ نہ بولنا۔

3.عرف صحیح وعرف فاسد

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "عرف صحیح وہ ہے جو کسی نص یا اجماع کے خلاف نہ ہو۔ اور عرف فاسد وہ ہے جو کسی نص یا اجماع کے خلاف ہو۔"[2]

عرف صحیح کی تعریف:

ایسا قولی یا فعلی رواج جس کو قبول کر لینے کی وجہ سے کوئی نص معطل اور بالکلیہ عمل سے محروم نہ ہو جاتی ہو اور وہ رواج شریعت کے مسلمہ عمومی قواعد و مقاصد کے خلاف نہ ہو یہ عرف صحیح ہے۔

عرف صحیح کی مثال:

عقد استصناع ہے اسی طرح مہر کو مؤجل اور معجل میں تقسیم کرنا یا نکاح کے پیغام کے وقت جو زیور اور کپڑا لڑکی کو دیا جاتا ہے وہ ہدیہ ہے مہر نہیں۔ یہ سب عرف صحیح ہے جس کی رعایت کی جائے گی۔

عرف فاسد کی تعریف:

اور ایسا رواج کہ اگر اس کو قبول کر لیا جائے تو کسی نص پر عمل فوت ہو جائے یا وہ مزاج شریعت کے تسلیم شدہ اصول و قواعد سے متصادم ہو عرف فاسد کہلاتا ہے۔

---

[1] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الاشباہ والنظائر ص۔89۔ دمشق: دار الفکر۔1999۔

[2] :۔ السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔ المبسوط جلد14، ص۔23۔ قاہرہ: دار الحدیث۔2019۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

عرف فاسد کی مثال:

جیسے سودی معاملات، زنا کا عموم، اور عورتوں کو میراث سے محروم کرنا، عورت و مرد کی مخلوط تعلیم یا اجلاس کرنا یہ عرف فاسد ہے۔ اس عرف کی رعایت نہیں کی جائے گی اس لیے کہ اس کی رعایت کرنے میں نص کا ابطال لازم آئے گا۔[1]

حنفی فقہاء نے عرف کی حجیت کے لیے قرآن، حدیث، اجماع اور عقل سے دلائل پیش کیے ہیں:

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ہمارے اصحاب نے عرف کے اعتبار پر دلیل لی ہے اللہ تعالیٰ کے قول سے: 'عرف کا حکم دو اور اس قول سے: 'اور عورتوں کے لیے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں معروف طریقے سے۔ پس اللہ نے عورتوں کے حقوق میں حکم کو معروف یعنی عرف کے ساتھ معلق کیا۔"[2]

امام ابن نجیم رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اور سنت سے نبی ﷺ کا قول ہے: 'مسلمان جس چیز کو بھلا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بھلی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عام عرف معتبر ہے۔"[3]

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی اجمعین نے بہت سے مسائل میں عرف کے اعتبار پر اجماع کیا ہے، جیسا کہ نفقہ، مہر اور اجرت کی مقدار کے تعین میں۔"[4]

امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اور عقلی دلیل یہ ہے کہ شارع اللہ تعالیٰ تو خلق کی مصلحتوں کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اور عرف ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے، لہٰذا وہ مردود نہیں ہو سکتا۔"[5]

حنفی فقہاء نے عرف کے معتبر ہونے کے لیے کئی شرائط وضع کی ہیں:

1. نص کے خلاف نہ ہو

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "پہلی شرط: یہ کہ عرف کسی نص یا اجماع کے خلاف نہ ہو۔ اگر وہ مخالف ہو تو وہ عرف فاسد ہے اور معتبر نہیں۔[6]

بعض عرف اس طرح کے ہوتے ہیں کہ جن کو شریعت نے اگرچہ اپنے حکم کے لیے علت نہیں بناتی لیکن جس چیز کو علت بناتی ہے اس عرف کی وجہ سے حکم کی علت ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے عرف کے ذریعہ بھی حکم شرعی میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن اس کو عرف کی وجہ سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ علت کی وجہ سے حکم کی تبدیلی ہے اس لیے کہ جو حکم علت کے ساتھ معلول ہو علت کے زائل ہونے سے حکم بھی زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے شروط فاسدہ اور عرف، یعنی فقہاء نے نہی عن بیع وشرط سے دو شرط کو مستثنیٰ کیا ہے:

- ✓ خیار کی شرط
- ✓ جو شرط لوگوں کا عرف بن جائے، اس لیے کہ بیع کے ساتھ شرط کی ممانعت کی جو علت تھی وہ ان دونوں شرطوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

2. عام اور مستقل ہو

3. پہلے سے موجود ہو

4. عقل اور فطرت کے مطابق ہو

---

[1] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین 2/115۔ قاہرہ، مصر: المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ۔ 1905۔

[2] :۔ السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔ المبسوط جلد 11، ص۔ 97۔ قاہرہ: دار الحدیث۔ 2019۔

[3] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الاشباہ والنظائر ص۔ 91۔ دمشق: دار الفکر۔ 1999۔

[4] :۔ ایضاً۔ المبسوط جلد 11، ص۔ 98۔ قاہرہ: دار الحدیث۔

[5] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین 2/47۔ قاہرہ، مصر: المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ۔ 1905۔

[6] :۔ السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔ المبسوط جلد 4، ص۔ 24۔ قاہرہ: دار الحدیث۔ 2019۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

عرف و قیاس کے تعارض کی مثالیں

1) بیع عینہ کا مسئلہ

عربی زبان میں عینہ کا مادہ عین ہے، جس کے معنی نقد رقم کے ہیں۔

"العِينةُ: أَن يبيعَ سِلعَةً بثَمَنٍ مَعْلُومٍ إِلى أَجَلٍ مُسَمًّى، ثُمَّ يشتَرِيها مِنَ المُشترِى بثَمَنٍ نَقْدٍ أَقَلَّ مِمَّا باعَها بهِ[1]."

ترجمہ: عینہ یہ ہے کہ کوئی سامان ایک متعین مدت کے ادھار پر کسی قیمت میں فروخت کیا جائے، پھر وہی سامان اسی خریدار سے بیچی گئی قیمت سے کم قیمت پر نقد واپس خرید لیا جائے۔

فقہِ حنفی کی روشنی میں علامہ ابنِ نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"صُورَتُہا أَنْ يبيعَ عَينًا بعَشَرَةٍ إِلَى أَجَلٍ، ثُمَّ يشْتَرِيهَا مِمَّنْ باعَهَا مِنْهُ بخَمْسَةٍ نَقْدًا."[2]

ترجمہ: اس کی صورت یہ ہے کہ ایک چیز عین دس روپے میں ادھار پر بیچی جائے، پھر وہی چیز اسی شخص سے پانچ روپے نقد میں واپس خرید لی جائے۔

دراصل قرض پر سود لینے کا ایک قانونی حیلہ ہے، جس میں ایک ہی سامان کو دو مرتبہ بیچا اور خریدا جاتا ہے تاکہ نقد رقم کا تبادلہ ہو سکے اور درمیان میں منافع کی صورت میں سود حاصل کیا جا سکے۔ **قیاس** کے ہاں.بیع عینہ فروخت کر کے واپس خریدنا قیاساً جائز ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں دو الگ الگ.بیع ہوتی ہیں اور **عرف** کے ہاں لوگوں کے عرف میں یہ سود کی ایک صورت ہے، اس لیے اسے ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَإِنْ كانَ الْقِياسُ يقْتَضِى جَوَازَ بيعِ الْعِينَةِ، لَكِنَّ الْعُرْفَ الْجَارِى بينَ النَّاسِ أَنَّهَا حِيلَةٌ عَلَى الرِّبا، فَيتْرَكُ الْقِياسُ لِلْعُرْفِ[3]"

اگرچہ قیاس.بیع عینہ کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، لیکن لوگوں میں رائج عرف یہ ہے کہ یہ سود پر حیلہ ہے، لہٰذا عرف کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

مثلاً آسان الفاظ میں اس کو یوں سمجھا جائے کہ جیسا کہ! ایک شخص کا کاروبار ہے، کہ لوگوں کو موبائل فونز قسطوں پر بیچتا ہے، اب ایک شخص کو نقد پیسوں کی ضرورت ہے، اور یہ شخص اس کاروباری شخص کے پاس آتا ہے اور موبائل فون قسطوں پر مانگتا ہے، اور یہ ضرورت مند شخص دوبارہ اسی دکاندار کو مجلس بدل کر نقد پر پانچ سو یا ہزار کم کر کے فروخت کرتا ہے۔ اب صورت ہذا جائز ہے یا ناجائز؟ تو اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ!

ضرورت مند شخص کا مقصد موبائل فون نہیں، بلکہ اُسے نقد پیسوں کی ضرورت ہے، اور مذکورہ کاروباری شخص سودی قرضہ کے لئے بطورِ حیلہ کے موبائل فون کا لین دین کر رہا ہے، جو کہ.بیع عینہ کی ایک صورت ہے، اور.بیع عینہ شرعاً مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے، کیونکہ یہ سود خوری ہی کا ایک طریقہ ہے، اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے عقد کو رسوائی اور ذلت کا سبب قرار دیا ہے، جیسا کہ ''سنن ابی داوٗد''میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان منقول ہے کہ جب تک تم.بیع عینہ کرتے رہو گے اور جانوروں کی دیکھ بھال میں لگے رہو گے اور زراعت میں گم ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ذلت و رسوائی مسلط کر دے گا، یہاں تک کہ تم دوبارہ دین کی طرف نہ لوٹ آؤ۔

2. اجارہ میں اجرت کا تعین

ایسے ہی فقہِ اسلامی میں اجارہ کرایہ یا مزدوری کے صحیح ہونے کے لیے اجرت کا متعین معلوم ہونا بنیادی شرط ہے۔ اگر اجرت معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ البتہ، اگر کسی معاملے میں اجرت طے نہ ہو تو وہاں اجرِ مثل مارکیٹ ریٹ / عرف کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

امام کاسانی رحمہ اللہ علیہ اجارہ کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَمِنْهَا أَى مِنْ شُرُوطِ الصِّحَّةِ: أَنْ تَكُونَ الْأُجْرَةُ مَعْلُومَةً، فَلَا يَصِحُّ مَعَ جَهَالَةِ الْأُجْرَةِ؛ لِمَا رُوِى عَنِ النَّبى ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مَنِ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَلْيُعْلِمْهُ أَجْرَهُ.[4]"

---

[1] :۔ حوالہ: ابن منظور، محمد بن مکرم۔ لسان العرب 13 / 304۔ بیروت، لبنان: دار صادر۔ 1993۔

[2] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الأشباہ والنظائر علی مذہب أبي حنیفۃ النعمان ص: 92۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ۔ 1999۔

[3] :۔ سرخسی، محمد بن احمد۔ المبسوط 13 / 56۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ۔ 1993۔

[4] :۔ کاسانی، ابو بکر بن مسعود۔ 1986۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع 4 / 185۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

اور صحتِ اجارہ کی شرائط میں سے یہ ہے کہ اجرت معلوم ہو، پس اجرت کی جہالت کے ساتھ اجارہ صحیح نہیں ہوگا؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا، اسے چاہیے کہ وہ اسے اس کی اجرت بتادے۔

مالکیہ کے نزدیک بھی اجرت کا تعین ضروری ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الْإِجَارَةُ لَا تَجُوزُ إِلَّا بِأُجْرَةٍ مَعْلُومَةٍ وَقَدْرٍ مَعْلُومٍ، فَإِنْ كَانَتْ مَجْهُولَةً لَمْ تَجُزْ لِأَنَّهُ غَرَرٌ. [1]"

اجارہ جائز نہیں ہوتا مگر معلوم اجرت اور معلوم مقدار کے ساتھ، پس اگر اجرت مجہول ہو تو یہ جائز نہیں کیونکہ یہ غرر دھوکا/خطرہ ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ کام اور اجرت دونوں واضح ہونے چاہئیں:

"وَلَا تَجُوزُ الْإِجَارَةُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْعَمَلُ مَعْلُومًا وَالْأَجْرُ مَعْلُومًا، فَإِذَا كَانَ أَحَدُهُمَا مَجْهُولًا فَسَدَتِ الْإِجَارَةُ. [2]"

ترجمہ: اجارہ جائز نہیں ہوتا یہاں تک کہ کام بھی معلوم ہو اور اجرت بھی معلوم ہو، پس اگر ان میں سے ایک بھی مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہو جائے گا۔

حنبلی فقہ میں بھی یہی اصول ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"يُشْتَرَطُ فِي الْإِجَارَةِ كَوْنُ الْأَجْرِ مَعْلُومًا، لَا نَعْلَمُ فِي ذَلِكَ خِلَافًا. [3]"

اجارہ میں اجرت کا معلوم ہونا شرط ہے، اور ہمیں اس اصول میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف معلوم نہیں ہے۔

اب اگر قیاس کو دیکھا جائے تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اجارہ میں اجرت کا تعین عقد کے وقت صراحت سے ہونا چاہیے، جبکہ عرف کے ہاں لوگوں کے عرف میں بغیر صراحت کے بھی اجرت متعین ہو جاتی ہے اگر اس جیسی چیز کی اجرت معروف ہو۔

امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الْعُرْفُ جَعَلَ الْمَعْرُوفَ كَالْمَشْرُوطِ، فَإِذَا كَانَتِ الْأُجْرَةُ مَعْرُوفَةً فِي الْعُرْفِ قَامَتْ مَقَامَ الشَّرْطِ، وَيقَدَّمُ ذَلِكَ عَلَى الْقِيَاسِ الَّذِي يَقْتَضِي الشَّرْطَ[4]"

ترجمہ: عرف نے معروف کو مشروط کی مانند بنا دیا ہے۔ جب اجرت عرف میں معروف ہو تو وہ شرط کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اور اسے اس قیاس پر مقدم کیا جائے گا جو شرط کا تقاضا کرتا ہے۔

عرف کے ذریعے نص کی تقیید کی مثالیں

پہلی مثال: وصیت کی عبارت

امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إِذَا قَالَ الرَّجُلُ: أَوْصَيْتُ بِثَوْبِي لِفُلَانٍ، فَإِنَّهُ يُحْمَلُ عَلَى الْعُرْفِ، فَإِنْ كَانَ الْعُرْفُ أَنَّ الثَّوْبَ يُطْلَقُ عَلَى الْمَلْبُوسِ خَاصَّةً، أُعْطِيَ الْمَلْبُوسَ، وَإِنْ كَانَ الْعُرْفُ أَنَّهُ يُطْلَقُ عَلَى الثِّيَابِ كُلِّهَا، أُعْطِيَ الْجَمِيعَ"[5]

ترجمہ: "جب کوئی شخص کہے: 'میں نے اپنا ثوب فلاں کو وصیت کیا' تو اسے عرف پر محمول کیا جائے گا۔ اگر عرف یہ ہے کہ 'ثوب' صرف پہننے والے کپڑے پر بولا جاتا ہے تو صرف وہی دیا جائے گا۔ اور اگر عرف یہ ہے کہ یہ تمام کپڑوں پر بولا جاتا ہے تو سب دے دیے جائیں۔"

امام مرغینانی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب "الہدایہ" میں اس مسئلے کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ کلامِ انسانی کا مفہوم متعین کرنے کے لیے لغت کے مقابلے میں عرف و عادت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ ہدایہ کی تشریح کے مطابق اگرچہ لفظ "ثوب" کپڑا لغوی اعتبار سے ہر قسم کے سلے اور ان سلے کپڑے کو شامل ہے، لیکن وصیت جیسے معاملات میں اس کا وہی مطلب لیا جائے گا جو وصیت کرنے والے موصی کے معاشرے میں عام طور پر رائج ہو۔ صاحب ہدایہ اس قاعدے کو "تخصیصِ عام بالعرف" کے تحت بیان کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ عرف کسی عام لفظ کے دائرے کو خاص کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی علاقے کے عرف میں "ثوب" صرف پہنے جانے والے لباس Garments کو کہا جاتا ہو اور تھان کے کپڑوں کو اس میں شامل نہ سمجھا جاتا ہو، تو وصیت صرف ملبوسات تک محدود رہے گی۔ ہدایہ کے مطابق کلام کو

---

[1] :۔ قرطبی، محمد بن احمد۔ 1964۔ الجامع لأحکام القرآن 13/ 291۔ قاہرہ، مصر: دار الکتب المصریۃ۔۔

[2] :۔ شافعی، محمد بن ادریس۔ الأم 3/ 251۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔ 1990۔

[3] :۔ ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد۔ المغنی 5/ 312۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ القاہرۃ۔ 1968۔

[4] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ رد المحتار علی الدر المختار 5/ 34۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ۔ 1992۔

[5] :۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الأشباہ والنظائر علی مذہب أبی حنیفۃ النعمان ص: 92۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ۔ 1999۔

لغو ہونے سے بچانے اور متکلم کی اصل مراد تک پہنچنے کے لیے "العرف محکم" کا اصول ہی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے تاکہ وصیت میں کسی ایسی چیز کو شامل نہ کیا جائے جو موصی کے عرف میں اس لفظ کے تحت نہ آتی ہو۔[1]

دوسری مثال: طلاق کی عبارت

امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"أَلْفَاظُ الطَّلَاقِ تُحْمَلُ عَلَى الْعُرْفِ، فَمَا تَعَارَفَهُ النَّاسُ طَلَاقًا يَقَعُ، وَمَا لَا يَتَعَارَفُونَ لَا يَقَعُ"[2]

ترجمہ: "طلاق کے الفاظ عرف پر محمول کیے جائیں گے۔ لوگ جسے عرفاً طلاق سمجھیں وہ واقع ہوگی، اور جسے نہ سمجھیں وہ واقع نہیں ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامی کی اس عبارت کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ طلاق کے وہ الفاظ جو صریح بالکل صاف نہیں ہیں بلکہ کنایہ اشارہ کنایہ ہیں، ان کا فیصلہ اس معاشرے کے رواج اور بول چال عرف پر ہوگا۔ ہدایہ اور دیگر کتب فقہ کی تشریح کے مطابق، اگرچہ لغت میں کسی لفظ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن اگر کسی علاقے کے لوگ کسی خاص جملے کو صرف طلاق ہی کے لیے استعمال کرتے ہوں، تو بولنے والے کی نیت پوچھے بغیر طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ وہاں وہ لفظ "عرفِ عام" میں طلاق کا نعم البدل بن چکا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لفظ لغوی طور پر سخت ہو لیکن عرف میں اسے طلاق کے لیے استعمال نہ کیا جاتا ہو، تو محض اس کے بولنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی جب تک کہ بولنے والے کی اپنی نیت طلاق کی نہ ہو۔ علامہ شامی علیہ الرحمہ کے اس اصول کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ نکاح جیسے اہم معاملے میں لوگوں کی گفتگو کو ان کے مقامی ماحول اور محاورے کی روشنی میں سمجھا جائے تاکہ کسی پر ناحق طلاق واقع نہ ہو اور نہ ہی کوئی صریح عرفی طلاق سے انکار کر سکے۔

فقہاء احناف نے عرف کے حوالے سے متعدد قواعد وضع کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

1. "الْعُرْفُ مُحَكَّمٌ"

فقہ حنفی کے قواعد میں سے ہے: عرف کو حکم مانا جاتا ہے، اور عادت کو حکم مانا جاتا ہے۔

2. "الْمَعْرُوفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ شَرْطًا"

جو چیز عرفاً معروف ہو وہ شرطاً مشروط کی مانند ہے، اور معاملات میں جو عرف جاری ہو وہ عقود میں مشروط کی طرح ہے۔"

3. "الْحَقِيقَةُ تُتْرَكُ بِدَلَالَةِ الْعُرْفِ"

جب حقیقت اور عرف میں تعارض ہو تو عرف کو حقیقت پر مقدم کیا جائے گا۔"

4. "لَا يُنْكَرُ تَغَيُّرُ الْأَحْكَامِ بِتَغَيُّرِ الْأَزْمَانِ"

"حنفیہ کے قواعد میں سے ہے: زمانوں کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عرف کی تبدیلی احکام کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے۔[3]

فقہ حنفی میں عرف وعادت محض ایک سماجی رواج نہیں بلکہ ایک مضبوط شرعی حجت ہے، جس پر بے شمار فقہی احکام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور ان کے جلیل القدر تلامذہ کے نزدیک عرف کو یہ مقام حاصل ہے کہ جہاں نص قرآن وسنت خاموش ہو، وہاں عرف کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ فقہائے احناف کا یہ مشہور قاعدہ "الثابت بالعرف کالثابت بالنص" اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عرف کو ثبوتِ حکم میں کتنا بلند مرتبہ حاصل ہے۔ عرف کی حجیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کا مقصد لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور تنگی کو دور کرنا ہے۔ اگر معاشرے میں رائج ان معاملات کو کالعدم قرار دے دیا جائے جو نصِ شرعی سے متصادم نہیں، تو لوگوں کے لیے روزمرہ کے لین دین میں شدید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔[4]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ فقہ حنفی میں عرف وعادت محض ایک ثانوی ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسی قوی حجت اور دلیل ہے جو نص کی عدم موجودگی میں قانونی خلا کو پُر کرتی ہے اور نصِ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید تک کا درجہ رکھتی ہے

[1] ۔ حوالہ: المرغینانی، برہان الدین ابوالحسن علی۔ الہدایہ فی شرح بدایۃ المبتدی جلد 4، ص۔ 452۔ کراچی: دار البشائر۔ 2008۔

[2] ۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الأشباہ والنظائر علی مذہب أبي حنیفة النعمان ص: 90۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیة۔ 1999۔

[3] ۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الأشباہ والنظائر علی مذہب أبي حنیفة النعمان ص: 92 / 84 / 97۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیة۔ 1999۔

[4] ۔ قاسمی، محمد مصعب۔ شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کے حدود و قیود ص: 52 / 66 / 78 / 99۔ دیوبند، انڈیا: مکتبہ النور۔ 2016۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

فقہ مالکی میں عرف کی حیثیت وحجت

فقہ مالکی میں عرف وعادت کی شرعی حیثیت اور حجیت دیگر فقہی مذاہب کے مقابلے میں زیادہ گہری اور ہمہ گیر ہے، کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک عرف کا تعلق براہِ راست "مصالح مرسلہ" اور "عملِ اہلِ مدینہ" جیسے کلیدی مآخذ سے ہے۔ مالکی فقہاء کے نزدیک یہ ایک مسلمہ قانونی قاعدہ ہے کہ "العرف قاضٍ علی اللفظ" یعنی عرف لغوی الفاظ پر حاکم اور قاضی کی حیثیت رکھتا ہے؛ چنانچہ جب کسی معاملے میں کلام کے لغوی معنی اور رائج عرف میں تعارض پیدا ہو، تو مالکی مسلک میں عرف کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ انسانی معاملات میں "حرج" اور تنگی پیدا نہ ہو۔ امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز تصنیف "الموافقات" میں اس نکتے کی صراحت فرمائی ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے انسانی عادات کا مکمل اعتبار کیا ہے، لہٰذا جو عرف کسی قطعی شرعی نص سے متصادم نہ ہو، اس کی پیروی واجب ہے۔ اسی طرح امام قرافی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الاحکام" میں اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ جو احکام عرف پر مبنی ہوتے ہیں، وہ عرف کے بدلنے سے لازماً بدل جاتے ہیں، اور ان کے نزدیک بدلے ہوئے حالات میں پرانے منقولہ فتاویٰ پر جمے رہنا دین کی صحیح سمجھ سے دوری ہے۔ فقہ مالکی میں عرف اس قدر قوی حجت ہے کہ یہ نصوصِ عامہ کی تخصیص اور مطلق احکام کی تقیید کا ذریعہ بھی بنتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالکی فقہ میں عرف محض ایک تائیدی دلیل نہیں بلکہ ایک مستقل قانونی ماخذ ہے جو معاشرتی تغیرات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے۔

فقہ اسلامی کی عظیم روایات میں فقہ مالکی کا مقام منفرد ہے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ علیہ متوفی 179ھ نے مدینہ منورہ کے اس فقہی ماحول میں اپنا مکتب فکر قائم کیا جو خود نبی کریم ﷺ کے شہر کی فقہ تھی۔ مدینہ کا عمل عمل اہل مدینہ ان کے نزدیک اجماع کی ایک صورت تھا، اور یہ در حقیقت عرف کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

فقہ مالکی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے "عمل اہل مدینہ" اور "عرف" کو غیر معمولی اہمیت دی۔ امام مالکؒ کا منہج یہ تھا کہ وہ نصوص کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان رائج عرف اور عمل کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک شریعت کی روح اور مقاصد مقاصد الشریعہ کا تحفظ اس وقت ممکن ہے جب عرف کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

مالکی فقہاء نے ایک مشہور ضابطہ وضع کیا:

"الْعُرْفُ شَرْطٌ كَالشَّرْطِ اللَّفْظِي بلْ أَقْوَى"[29]

یعنی عرف لفظی شرط کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قوی ہے۔

تعریفات العرف عند المالکیہ:

فقہاء مالکیہ نے بھی نے عرف کی متعدد تعریفات کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

1) امام مالک بن انس رحمہ اللہ علیہ سے عرف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

ترجمہ: "عرف وہ ہے جسے لوگ اپنے معاش اور معاملات میں استعمال کریں، بشرطیکہ وہ کتاب اللہ اور سنت نبی کے خلاف نہ ہو۔"[30]

2) امام شمس الدین القرطبی رحمہ اللہ علیہ متوفی 671ھ جو مالکی المذہب ہیں، فرماتے ہیں:

"الْعُرْفُ: مَا تَعَارَفَهُ النَّاسُ فِي مُعَامَلَاتِهِمْ وَمَشْرَبِهِمْ وَمَلْبَسِهِمْ وَمَسْكَنِهِمْ، وَجَرَى بِهِ الْعَمَلُ بيْنَهُمْ مِنْ غَيْرِ نَصٍّ يُخَالِفُهُ"[31]

ترجمہ: "عرف وہ ہے جسے لوگ اپنے معاملات، کھانے پینے، پہننے اور رہن سہن میں باہم جانتے ہوں، اور ان کے درمیان اس پر عمل جاری ہو، بشرطیکہ کوئی نص اس کے خلاف نہ ہو۔"

3) امام ابو اسحاق الشاطبی رحمہ اللہ علیہ متوفی 790ھ جو مالکی مکتب کے عظیم ترین اصولی ہیں، فرماتے ہیں:

"الْعُرْفُ: مَا اسْتَقَرَّتْ عَلَيْهِ النُّفُوسُ وَسَكَنَتْ إِلَيْهِ الطَّبَائِعُ مِنَ الْأُمُورِ الْعَادِيَّةِ، وَكَانَ لَهُ قُوَّةٌ فِي الْقُلُوب بحَيْثُ يَصِيرُ كَأَنَّهُ مِنَ الْفِطْرَةِ الْأَصْلِيَّةِ"[32]

---

[29] ۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعہ رسائل ابن عابدین جلد2، ص۔115۔ لاہور: سہیل اکیڈمی۔ 1901۔

[30] ۔ ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد۔ المقدمات الممہدات جلد1، ص۔234۔ بیروت: دار الغرب الإسلامي۔ 1988۔

[31] ۔ القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد۔ الجامع لاحکام القرآن جلد2، ص۔96۔ بیروت: مؤسسة الرسالہ۔ 2006۔

[32] ۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ *الموافقات فی اصول الشریعہ* جلد2، ص۔285۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 1997

ترجمہ:"عرف وہ ہے جس پر نفوس مستقر ہو جائیں اور طبائع اس سے سکون پائیں عادی امور میں، اور یہ دلوں میں اتنی قوت رکھتا ہو کہ گویا وہ فطرت اصلیہ کا حصہ بن جائے۔"

فقہاءمالکیہ کے نزدیک عرف کی اقسام:

مالکی فقہاءنے عرف کو متعدد اعتبارات یعنی باعتبارِماہیت قولی و فعلی، باعتبارِ دائرہ کار عام و خاص، باعتبارِ شرعی حیثیت صحیح و فاسد سے تقسیم کیا ہے ہم مختصرا ان کا جائزہ لیتے ہیں:

1. عرف عام و عرف خاص

امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عام وہ جو تمام شہروں میں لوگوں کی اکثریت کے درمیان جاری ہو۔ اور خاص وہ جو کسی خاص صنعت یا خاص شہر والوں میں جاری ہو۔[33]"

1. عرف قولی و عرف عملي

عرفِ قولي:

اس سے مراد وہ الفاظ یا اصطلاحات ہیں جو کسی خاص معاشرے میں اپنے لغوی معنی کے بجائے کسی دوسرے مخصوص معنی میں مشہور ہو جائیں۔

عرفِ فعلی عملي:

اس سے مراد لوگوں کے وہ کام یا لین دین کے طریقے ہیں جو معاشرے میں رواج پا چکے ہوں، جیسے "بیعِ تعاطي" بغیر زبان سے کہے محض چیز لینے اور پیسے دینے سے سودا مکمل ہو جانا۔

3. عرف صحیح و عرف فاسد

امام قرطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عرف صحیح وہ ہے جو کسی نص کے خلاف نہ ہو۔ اور عرف فاسد وہ ہے جو کسی نص یا اجماع کے خلاف ہو۔ پہلے پر عمل کیا جائے گا اور دوسرے کو رد کر دیا جائے گا۔[34]"

مالکی فقہاءنے عرف کی حجیت کے لیے قرآن، سنت، عمل اہل مدینہ اور مقاصد شریعہ سے دلائل پیش کیے ہیں:

امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ:"مالکیہ نے عرف کے اعتبار پر دلیل لی ہے اللہ تعالیٰ کے قول سے:'عرف کا حکم دو اور اس قول سے: اور عورتوں کے لیے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں معروف طریقے سے اور اس قول سے:'اور ان کے ساتھ معروف طریقے سے زندگی گزارو یہ نصوص اس بات کی دلیل ہیں کہ معروف جو عرف ہے شریعت میں معتبر ہے۔"[35]

امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ:"اور سنت سے نبی ﷺ کا قول ہے:'مسلمان جس چیز کو بھلا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بھلی ہے'مسند احمد۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عام عرف جس پر مسلمان مستقر ہو گئے ہوں وہ حجت ہے۔[36]

مالکی فقہ کی سب سے نمایاں دلیل "عمل اہل مدینہ" ہے جو در حقیقت عرف کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

[33] :۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ الموافقات فی اصول الشریعہ جلد2، ص۔287۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔1997۔

[34] :۔ القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد۔ الجامع لاحکام القرآن جلد2، ص۔178۔ بیروت: مؤسسۃ الرسالہ۔2006۔

[35] :۔ لشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ *الموافقات فی اصول الشریعہ* جلد2، ص۔289۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔1997۔

[36] :۔ ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد۔ المقدمات الممہدات جلد1، ص۔237۔ بیروت: دار الغرب الإسلامی۔1988۔

"عَمَلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ عِنْدَ مَالِكٍ حُجَّةٌ، وَهُوَ لَيْسَ إِلَّا عُرْفًا خَاصًّا بِأَهْلِ الْعِلْمِ وَالْفَضْلِ فِي ذَلِكَ الْبَلَدِ، ثُمَّ هُوَ فِي الْحَقِيقَةِ أَصْلٌ مِنْ أُصُولِ اعْتِبَارِ الْعُرْفِ عَامَّةً"[37]

ترجمہ:"مالک کے نزدیک عمل اہل مدینہ حجت ہے، اور یہ در حقیقت اس شہر کے اہل علم و فضل کا خاص عرف ہے، پھر یہ حقیقت میں عرف کے اعتبار کا ایک اصل ہے۔"

امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ نے مقاصد شریعہ کے ذریعے عرف کی حجیت کو مضبوط کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"وَمِنَ الْمَقَاصِدِ الْعَامَّةِ لِلشَّرِيعَةِ: رَفْعُ الْحَرَجِ وَجَلْب الْمَصَالِحِ. وَالْعُرْفُ هُوَ الطَّرِيقُ الَّذِي يَدُلُّ عَلَى مَصَالِحِ النَّاسِ فِي زَمَانِهِمْ وَمَكَانِهِمْ، فَلَا يَكُونُ مُهْمَلًا"[38]

ترجمہ:"اور شریعت کے عمومی مقاصد میں سے ہے: حرج کا اٹھانا اور مصالح کا حصول۔ عرف وہ راستہ ہے جو لوگوں کی مصلحتوں کی طرف ان کے زمانے اور مکان میں راہنمائی کرتا ہے، لہٰذا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

شرائط العرف عند المالکیہ:

مالکی فقہاء نے عرف کے معتبر ہونے کے لیے کئی شرائط وضع کی ہیں:

1. نص کے خلاف نہ ہو
2. عام اور مستقل ہو
3. قدیم اور مستقر ہو
4. فساد اور خرابی کا باعث نہ ہو

مالکی فقہ میں عرف کو قیاس پر مقدم کیا جاتا ہے، خاص طور پر جہاں قیاس سے سخت گیری پیدا ہوتی ہو، امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

"الْمَالِكِيَّةُ يُقَدِّمُونَ الْعُرْفَ عَلَى الْقِيَاسِ الْمُجَرَّدِ، لِأَنَّ الْعُرْفَ أَقْرَب إِلَى مَقَاصِدِ الشَّارِعِ، وَأَرْفَقُ بالنَّاسِ"[39]

ترجمہ:"مالکیہ عرف کو مجرد قیاس پر مقدم کرتے ہیں، کیونکہ عرف شارع کے مقاصد کے زیادہ قریب ہے اور لوگوں کے لیے زیادہ آسان ہے۔"

عرف و قیاس کے تعارض کی مثالیں

پہلی مثال:.بیع کے الفاظ میں تسامح

.بیع کے الفاظ میں تسامح سے مراد وہ نرمی یا وسعت ہے جس کے تحت خرید و فروخت کے معاملے میں استعمال ہونے والے الفاظ میں معمولی لغزش یا لغوی گہرائی کے بجائے فریقین کی نیت اور عرفِ عام لوگوں میں رائج طریقے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک.بیع کے الفاظ میں تسامح کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان کے فقہی منہج میں الفاظ سے زیادہ مقاصد اور معنی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک.بیع صرف مخصوص عربی الفاظ جیسے "بعتُ" یا "اشتریتُ" تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ لفظ یا اشارہ جو فریقین کی رضامندی کو واضح کر دے،.بیع کے انعقاد کے لیے کافی ہے۔ ان کے نزدیک.بیع میں اصل چیز "تراضي" دونوں کی خوشی ہے، لہٰذا اگر الفاظ میں کوئی لغوی غلطی ہو یا بولنے والا ایسے الفاظ استعمال کرے جو صریح نہ ہوں لیکن عرف میں ان سے مراد خرید و فروخت ہی لی جاتی ہو، تو اسے تسامح کے طور پر قبول کیا جائے گا اور عقد صحیح تسلیم ہو گا۔ اسی تسامح کی بنیاد پر امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں ".بیعِ تعاطي" بھی جائز ہے، جس میں فریقین زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں کرتے بلکہ صرف لین دین کے عمل سے سودا مکمل کر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زبان کا تسامح یا الفاظ کی کمی بیشی معاملے کو اس وقت تک خراب نہیں کرتی جب تک کہ فریقین کی مراد اور چیز کی قیمت و مقدار واضح ہو۔ اگر کسی نے مذاق میں یا غیر سنجیدہ انداز میں ایسے الفاظ کہے جن سے.بیع کا شبہ ہوتا ہو لیکن اس کی نیت.بیع کی نہ ہو، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وہاں الفاظ کے بجائے نیت کا اعتبار ہو گا، جو کہ فقہی لچک اور تسامح کی ایک بڑی مثال ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ اسلوب عملِ اہل مدینہ اور معاشرتی عرف کے عین مطابق ہے، جہاں معاملات کی بنیاد محض لفظی باریکیوں پر رکھنے کے بجائے باہمی اعتماد اور واضح مفہوم پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک اگر عقد کے الفاظ میں کوئی ابہام ہو لیکن قرائن سے بات واضح ہو رہی ہو، تو اسے باطل قرار دینے کے بجائے درست مانا جائے گا تاکہ لوگوں کے معاملات میں تنگی پیدا نہ ہو۔

امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

[37] ۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ الموافقات فی اصول الشریعہ جلد 3، ص۔ 112۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 1997۔

[38] ۔ ایضا، الموافقات فی اصول الشریعہ جلد 2، ص۔ 291۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

[39] ۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ الموافقات فی اصول الشریعہ جلد 3، ص۔ 115۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 1997۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

"الْقِيَاسُ يَقْتَضِي أَنْ تَكُونَ أَلْفَاظُ الْبَيْعِ عَلَى حَقِيقَتِهَا اللُّغَوِيَّةِ، لَكِنَّ الْعُرْفَ الْجَارِي بَيْنَ النَّاسِ يُسَوِّغُ التَّسَامُحَ فِي ذَلِكَ، فَيُقَدَّمُ الْعُرْفُ"[40]

ترجمہ: "قیاس کا تقاضا ہے کہ بیع کے الفاظ اپنی لغوی حقیقت پر ہوں، لیکن لوگوں میں رائج عرف اس میں تسامح کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا عرف کو مقدم کیا جائے گا۔"

یعنی امام مالک رحمہ اللہ علیہ اور ان کے مقلدین کے نزدیک بیع کے لیے مخصوص اور متعین الفاظ جیسے 'میں نے بیچا' یا 'میں نے خریدا' کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ مالکیہ کے ہاں اصل اعتبار "رضائے الہی" اور فریقین کے "ارادے" کا ہے، نہ کہ محض لفظی صورت گری کا۔ اگر خرید و فروخت کے وقت فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں جو لغوی طور پر بیع کے لیے وضع نہ کیے گئے ہوں، لیکن اس معاشرے کے عرف وعادت میں ان سے مراد خرید و فروخت ہی لی جاتی ہو، تو مالکی فقہ میں ایسی بیع مکمل طور پر صحیح اور نافذ تصور کی جائے گی۔ اسے ہی "الفاظ میں تسامح" کہا جاتا ہے، یعنی الفاظ کی سختی کے بجائے لوگوں کے باہمی تعامل اور عرفی مفہوم کو قبول کرنا۔ اسی اصول پر مالکیہ "بیعِ تعاطی" (بغیر زبان سے کچھ کہے، محض چیز لینے اور پیسے دینے) کو بھی جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک عرفِ عام میں یہ عمل فروخت کرنے کی قطعی علامت ہے اور شریعت کا مقصد معاملات کو آسان بنانا ہے، نہ کہ انہیں پیچیدہ الفاظ میں الجھانا۔

دوسری مثال: اجارہ میں تسلیم کا طریقہ

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اجارہ میں تسلیم کا مفہوم یہ ہے کہ مالک کرایہ دار کو اس چیز پر ایسا مکمل اختیار اور قدرت دے دے کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اسے فقہی اصطلاح میں "تمکین" کہا جاتا ہے۔ اگر مکان یا دکان کا معاملہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مالک اس جگہ کو اپنے ہر قسم کے سامان سے خالی کر کے چابیاں کرایہ دار کے حوالے کر دے۔ جب تک مالک کی کوئی چیز وہاں موجود ہے یا وہ اس کے استعمال میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈال رہا ہے، تب تک تسلیم کا عمل مکمل نہیں مانا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اجارہ دراصل وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے منافع کی بیع ہے، اس لیے ان کے ہاں تسلیم ایک جاری رہنے والا عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کرایہ دار اس چیز کو استعمال کر رہا ہے، مالک اسے نفع فراہم کر رہا ہے۔ اگر مدتِ اجارہ کے دوران کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کرایہ دار اس چیز سے فائدہ نہ اٹھا سکے، جیسے مکان گر جائے یا سواری کا جانور بیمار ہو جائے، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس مدت کا کرایہ ساقط ہو جائے گا کیونکہ مالک نفع کی تسلیم پر قادر نہیں رہا۔ کرایہ یا اجرت کی ادائیگی کا وجوب بھی براہِ راست تسلیم سے جڑا ہوا ہے۔ جیسے ہی مالک نے چیز کرایہ دار کے تصرف میں دے دی اور کرایہ دار اسے استعمال کرنے کے قابل ہو گیا، اب کرایہ دار پر اجرت ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے، چاہے وہ اسے عملاً استعمال کرے یا اپنی مرضی سے چھوڑ دے۔ تاہم، تسلیم کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ چیز اسی حالت میں ہو جس کے لیے معاہدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اگر زراعت کے لیے زمین لی گئی ہے تو اس کی تسلیم تبھی درست ہو گی جب وہ کھیتی کے قابل ہو اور وہاں پانی کا انتظام ہو سکے۔

امام قرافی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الْقِيَاسُ يَقْتَضِي أَنْ يَكُونَ التَّسْلِيمُ فِي الْإِجَارَةِ بِصُورَةٍ مَخْصُوصَةٍ، لَكِنَّ الْعُرْفَ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الْبُلْدَانِ، فَيُعْمَلُ بِالْعُرْفِ فِي كُلِّ بَلَدٍ"[41]

ترجمہ: "قیاس کا تقاضا ہے کہ اجارہ میں تسلیم ایک خاص صورت میں ہو، لیکن عرف شہروں کے مطابق مختلف ہوتا ہے، لہٰذا ہر شہر میں عرف کے مطابق عمل کیا جائے گا۔"

مالکی فقہ کی سب سے نمایاں خصوصیت "عمل اہل مدینہ" ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک مدینہ منورہ کے اہل علم کا عمل اجماع کی ایک صورت ہے اور یہ درحقیقت عرف کی اعلیٰ ترین شکل ہے، امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"عَمَلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ عِنْدَ مَالِكٍ هُوَ الْعُرْفُ الْأَصْلِي الَّذِي تَلَقَّتْهُ الْأُمَّةُ بِالْقَبولِ، وَهُوَ عُرْفٌ مُسْتَنِدٌ إِلَى سُنَّةٍ فِعْلِيَّةٍ مُتَوَاتِرَةٍ"[42]

ترجمہ: "مالک کے نزدیک عمل اہل مدینہ وہ اصلی عرف ہے جسے امت نے قبول کیا، اور یہ ایک فعلی سنت متواترہ پر مبنی عرف ہے۔"

---

[40] :۔ ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد۔ المقدمات الممھدات جلد 1، ص۔ 45۔ بیروت: دار الغرب الإسلامی۔ 1988۔

[41] :۔ القرافی، ابو العباس احمد بن ادریس۔ 1994۔ الفروق: أنوار البروق فی أنواء الفروق جلد 4، ص۔ 89۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ 1999۔ الأشباہ والنظائر علی مذھب أبی حنیفۃ النعمان ص: 92/84/97۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ۔

[42] :۔ الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ 1997۔ الموافقات فی اصول الشریعہ جلد 3، ص۔ 118۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

قواعد العرف عند المالکیہ:

امام مالک رحمہ اللہ کا فقہی مکتبہ فکر اپنی وسعت اور لچک کی وجہ سے ممتاز ہے، جس میں انسانی زندگی کے رواج اور معاشرتی رویوں کو شرعی احکامات کی تفہیم میں کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عرف محض ایک ثانوی چیز نہیں، بلکہ ایک ایسی مضبوط بنیاد ہے جس پر معاملات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ان کے فقہی اصولوں کے مطابق، جب معاشرے میں کوئی بات بطورِ رواج جڑ پکڑ لیتی ہے، تو وہ قانونی طور پر ایک طے شدہ شرط کی مانند ہو جاتی ہے۔ اسی تناظر میں مالکیہ کے ہاں یہ اہم قواعد رائج ہیں کہ:

الْعُرْفُ شَرْطٌ كَالشَّرْطِ اللَّفْظِي بلْ أَقْوَى"

امام قرافی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عرف لفظی شرط کی طرح ہے بلکہ اس سے زیادہ قوی ہے، کیونکہ لفظی شرط کو لوگ بھول سکتے ہیں جبکہ عرف کو نہیں بھولتے۔"

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس قاعدے کے مطابق اس عظیم فقہی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے کہ معاملات میں زبان سے کہے گئے الفاظ ہی سب کچھ نہیں ہوتے، بلکہ معاشرے کا رواج ان الفاظ کا متبادل یا ان سے بھی زیادہ طاقتور ثابت ہوتا ہے۔ اس قاعدے کی تشریح یہ ہے کہ جب کسی علاقے کے لوگ خرید و فروخت، اجارہ یا دیگر معاملات میں ایک خاص طریقے کے عادی ہو جائیں، تو وہ رواج ایک "خاموش شرط" بن جاتا ہے۔ اگرچہ فریقین معاہدہ کرتے وقت اس رواج کا زبان سے تذکرہ نہ بھی کریں، تب بھی امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وہ معاہدہ اسی عرفی شرط پر مبنی سمجھا جائے گا، گویا اسے تحریری طور پر لکھا گیا ہو۔ اس قاعدے کو لفظی شرط سے زیادہ قوی بلْ أَقْوَى اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ لفظی شرط کبھی کبھی محض رسمی ہو سکتی ہے یا اسے بھولنے کا امکان ہوتا ہے، لیکن عرف ایک اجتماعی شعور اور مسلسل عمل ہے جو فریقین کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عرف کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا لفظ استعمال کرے جس کے لغوی معنی کچھ اور ہوں لیکن عرف میں اس کا مفہوم بدل چکا ہو، تو وہاں لغت کے بجائے عرفی مفہوم کو ہی قانونی طور پر معتبر مانا جائے گا۔ مالکیہ کے ہاں اس کی عملی مثال یہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں گھر کرایے پر لیتے وقت پانی کا بل مالک کے ذمے ہونا رواج ہے، تو معاہدے میں اس کا ذکر نہ ہونے کے باوجود مالک ہی بل ادا کرنے کا پابند ہو گا۔ یہاں عرف نے ایک ایسی مضبوط شرط کا کام کیا جسے لفظی طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ اسلوب معاملات میں الجھنوں کو ختم کرنے اور معاشرتی استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت اہم ہے۔

الْمَعْرُوفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ لَفْظًا"

امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

معاملات میں جو عرف جاری ہو وہ عقود میں مشروط کی طرح ہے، اور اس پر وفا کرنا واجب ہے جیسے شرط پر وفا کرنا واجب ہے۔"

دوسرا قاعدہ "الْمَعْرُوفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ لَفْظًا" درحقیقت پہلے قاعدے ہی کی ایک عملی شکل اور اس کی قانونی وضاحت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز معاشرے کے رواج میں معروف اور طے شدہ ہے، اسے شرعی اور قانونی طور پر ویسا ہی سمجھا جائے گا جیسے اسے زبان سے شرط کے طور پر واضح کر دیا گیا ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عقد معاہدے کے وقت ہر چھوٹی بڑی بات کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہوتا، اسی لیے وہ عرف کو ایک "خاموش ترجمان" قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کسی معاملے میں فریقین خاموش رہیں، تو ان کی خاموشی کو اس علاقے کے معروف رواج پر رضامندی تصور کیا جائے گا۔ اس قاعدے کی تشریح یہ ہے کہ عرفی طور پر معروف بات کو "معاہدے کا حصہ "تسلیم کیا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کسی نے کوئی چیز خریدی اور اس کی واپسی یا نقص عیب کے حوالے سے کوئی شرط طے نہیں کی، تو اس علاقے میں عیب کی واپسی کا جو رواج ہو گا، وہی اس معاہدے پر لفظی شرط کی طرح نافذ ہو گا۔

یہ قاعدہ اس لیے اہم ہے کہ یہ معاملات میں پیدا ہونے والے تنازعات کا راستہ روکتا ہے۔ جب ایک بات معاشرے میں معروف ہے، تو فریقین اس سے لاعلمی کا دعویٰ نہیں کر سکتے، بلکہ وہ معروف بات ان کے درمیان ایک غیر مکتوب معاہدے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مالکی فقہاء اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی علاقے میں یہ معروف ہے کہ مکان کا کرایہ مہینے کے آخر میں دیا جائے گا، تو مالک مکان مہینے کے شروع میں کرایے کا مطالبہ نہیں کر سکتا، چاہے معاہدے میں ادائیگی کا وقت نہ بھی لکھا گیا ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ "معروف "رواج اس طرح نافذ ہو گا گویا عقد کے وقت یہ شرط لکھی گئی تھی کہ "کرایہ مہینے کے اختتام پر

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

دیاجائے گا"۔ یہ اصول ثابت کرتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی فقہ معاشرتی نظم اور باہمی اعتماد کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔"اَلْعَادَۃُ مُحَکَّمَۃٌ"امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:مالکیہ کے قواعد میں سے ہے:عادت کو حکم ماناجاتا ہے۔ لہٰذالوگ جس چیز کو باہم جانتے ہوں اور ان کی عادت اس پر جاری ہو وہ احکام میں معتبر ہے۔

یہ قاعدہ امام مالک رحمہ اللہ کے فقہی اصولوں کا ایک نہایت جامع اور کلیدی قاعدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں رائج "عادت" یا "رواج" کو ایک جج اور فیصلے کی بنیاد بنایا جائے گا۔ جب کبھی کسی معاملے، عقد یا گفتگو میں کوئی ایسا ابہام پیدا ہو جائے جس کا حل کتاب و سنت کے واضح الفاظ میں نہ ملے، تو وہاں امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس علاقے کی عادت کو بطورِ حکم فیصلہ کن قوت تسلیم کیا جائے گا۔ یہ قاعدہ دراصل لوگوں کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ایک ٹھوس پیمانہ فراہم کرتا ہے۔ اس قاعدے کی تشریح یہ ہے کہ لوگوں کے وہ افعال جو بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے معاشرے میں ایک مستقل پہچان اختیار کر چکے ہوں، وہ قانون کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کسی شخص نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، تو اس کا وہی مطلب لیا جائے گا جو اس معاشرے کی عادت میں رائج ہے۔ اسی طرح اگر خرید و فروخت میں کسی چیز کی مقدار یا کوالٹی واضح نہ ہو، تو اس کا فیصلہ اس بازار کی "عادت" کے مطابق کیا جائے گا۔ یہاں " محکمہ "کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عادت کو ایک ثالث یا قاضی کی طرح فیصل قرار دیا گیا ہے۔ مالکیہ کے ہاں اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مزدور کو کام پر رکھا اور اجرت مزدوری طے کرنا بھول گیا، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس مزدور کو اس کام کی وہ اجرت دی جائے گی جو اس شہر کی عادت میں معروف ہے جسے اجرتِ مثل کہا جاتا ہے۔ یہاں "عادت" نے ایک قانونی حکم کا کام کیا اور دونوں کے درمیان ممکنہ جھگڑے کو ختم کر دیا۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ اسلوب ظاہر کرتا ہے کہ دینِ اسلام انسانی زندگی کے فطری بہاؤ اور معاشرتی اقدار کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ **"تَغَيُّرُ الْفَتْوَى بتَغَيُّرِ الْعُرْفِ"**امام قرافی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"زمانوں، مکانوں، حالات اور عرف کی تبدیلی سے فتویٰ کی تبدیلی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مالکیہ کے نزدیک ایک عظیم اصول ہے۔[43]"

چوتھا قاعدہ "تَغَيُّرُ الْفَتْوَى بتَغَيُّرِ الْعُرْفِ" امام مالک رحمہ اللہ کے فقہی مکتبہ فکر کی وسعت، زندہ جاوید ہونے اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بہترین مثال ہے۔ اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شرعی احکامات یا فتاویٰ جن کی بنیاد کسی خاص زمانے یا علاقے کے عرف و رواج پر ہوتی ہے، جب وہ عرف بدل جائے تو ان پر مبنی فتویٰ بھی بدل جاتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک شریعت کے وہ احکام جو نص قرآن و سنت سے براہِ راست طے شدہ ہیں وہ تو اٹل ہیں، لیکن وہ معاملات جو معاشرتی مصلحت اور رواج کے تابع تھے، انہیں جامد نہیں رکھا جا سکتا۔ اس قاعدے کی تشریح یہ ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی سے جب لوگوں کے رہنے سہنے، لین دین اور باہمی تعلقات کے طریقے بدلتے ہیں، تو فقہ کی روح یہ تقاضا کرتی ہے کہ فتویٰ میں بھی لچک پیدا کی جائے تاکہ لوگوں کے لیے تنگی نہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی پرانا فتویٰ کسی نئے دور کے عرف سے متصادم ہو کر لوگوں کے لیے حرج مشقت کا باعث بن رہا ہو، تو وہاں اسی قدیم فتوے پر اصرار کرنا درحقیقت دین کے مقصدِ سہولت کے خلاف ہوگا۔ یہ اصول فقہ مالکی کو ایک "ارتقائی فقہ "بناتا ہے جو ہر زمانے کے مسائل کا حل اسی دور کے حالات کے مطابق پیش کرتی ہے۔ مالکی فقہاء اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی سابقہ دور میں کوئی خاص کام عیب سمجھا جاتا تھا اور اس کی بنیاد پر گواہی مسترد کر دی جاتی تھی، لیکن بعد کے دور میں وہ کام عام ہو گیا اور اسے برا نہ سمجھا جانے لگا، تو امام مالک رحمہ اللہ کے اصول کے مطابق اب اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی۔ یہاں عرف کی تبدیلی نے فتوے کی بنیاد بدل دی۔ یہ قاعدہ ثابت کرتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک فقہ کوئی بے روح ڈھانچہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ فقہ مالکیہ میں عرف و عادت محض ایک ثانوی ماخذ نہیں بلکہ ایک ایسی قوی شرعی حجت ہے جو "مصالح مرسلہ" اور "مقاصدِ شریعہ" کی روح سے پیوست ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کے نزدیک عرف کی حیثیت ایک ایسے "قاضی" کی ہے جو الفاظ کے ظاہری حصار کو توڑ کر متکلم کی اصل مراد اور معاشرتی ضرورت کو آشکار کرتا ہے۔ مالکی فقہاء کی تحقیقات، خصوصاً امام شاطبی رحمہ اللہ علیہ اور امام قرافی رحمہ اللہ علیہ کے افکار یہ ثابت کرتے ہیں کہ شریعت کا نظامِ عدل جامد نہیں بلکہ انسانی عادات کے تغیر کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا، فقہ مالکیہ میں عرف کی حجیت کو تسلیم کرنا درحقیقت دینِ اسلام کی اس وسعت اور لچک کا اعتراف ہے جو اسے ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ایک قابلِ عمل اور فطری ضابطہ حیات بناتی ہے۔ یہ اصول نہ صرف معاملات میں پیدا ہونے والے "حرج" کو دور کرتا ہے بلکہ اسلامی قانون کو انسانی ضرورتوں کا حقیقی ترجمان بھی بناتا ہے۔

[43] :۔ الشاطبی، ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ الموافقات فی اصول الشریعہ جلد 3، ص۔ 118 / 212۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ 1997۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

فقہ حنفی و فقہ مالکی میں فقہی مناہج کا تقابل

فقہ حنفی اور فقہ مالکی کے انفرادی مباحث میں عرف کی حجیت اور اہمیت کا مطالعہ کرنے کے بعد، اب ان دونوں عظیم دبستانِ فقہ کے منہج اور اسلوب کا تقابل وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگرچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ اور امام مالک بن انس رحمہ اللہ علیہ دونوں ہی عرف کو نصوص کی عدم موجودگی میں ایک قوی شرعی حجت تسلیم کرتے ہیں، تاہم ان کے استدلال کے طریقے اور عرف کے دائرہ کار میں لطیف علمی فرق پائے جاتے ہیں۔ جہاں احناف کے ہاں عرف کی حجیت کا زیادہ تر تعلق "استحسان" اور کلامِ متکلم کی مراد متعین کرنے سے ہے، وہاں مالکیہ کے ہاں عرف کا رشتہ براہِ راست "مصالح مرسلہ" اور "عملِ اہلِ مدینہ" جیسی گہری اصولی بنیادوں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ نہ صرف ان دونوں فقہی مذاہب کی وسعتِ نظری کو واضح کرے گا بلکہ یہ بھی آشکار کرے گا کہ کس طرح زمان و مکان کے تغیر کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان فقہاء نے انسانی معاملات میں پیدا ہونے والے "حرج" کو دور کرنے کے لیے عرف کو ایک فیصلہ کن قانون کے طور پر استعمال کیا۔

فقہ حنفی اور فقہ مالکی دونوں نے عرف رواج کو بطور اہم فقہی ماخذ تسلیم کیا ہے، تاہم ان کے مناہج طریقہ کار میں عرف کو اختیار کرنے کی بنیاد، اس کا درجہ، اور اطلاق کے حوالے سے نمایاں فرق موجود ہے۔ جہاں حنفیہ عرف کو "استحسان" کے تحت قیاس پر مقدم کرتے ہیں، وہیں مالکیہ عرف کو "مصالح مرسلہ" اور "عمل اہل مدینہ" کے تصورات کے تحت ایک وسیع تر اور زیادہ لچکدار انداز میں اپناتے ہیں۔ دونوں مسلک عرف کو قانونی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کے نقطہ آغاز میں بنیادی فرق ہے:

فقہ حنفی استحسان کی بنیاد پر:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے عرف کو استحسان کے تحت ایک الگ ماخذ کے طور پر وضع کیا۔ اس نقطہ نظر کے تحت جب قیاس سے کوئی سخت یا غیر موزوں نتیجہ نکلتا ہے، تو وہاں عرف یا عمومی ضرورت کو دیکھ کر اس قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے اور زیادہ مناسبت والا حکم دیا جاتا ہے، یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک عرف ایک معتبر دلیل ہے، بشرطیکہ نص کے خلاف نہ ہو، عام اور غالب ہو، اصولی قاعدہ "الثابت بالعرف کالثابت بالنص" ایسے ہی اگر کسی لفظ کے کئی معانی ہوں تو عرف کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلا

"دابة" کا لغوی معنی ہر جاندار ہے، مگر عرف میں اس سے مخصوص جانور مراد لیے جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی بیع، نکاح، اجارہ وغیرہ میں عرف کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔

فقہ مالکی مصالح اور عمل کی بنیاد پر:

امام مالک بن انس کے نزدیک عرف کا درجہ زیادہ وسیع ہے۔ ان کے نزدیک عرف نہ صرف استحسان کے تحت آتا ہے بلکہ یہ "مصالح مرسلہ" کا حصہ ہے۔ مزید، مدینہ منورہ کے لوگوں کا "عمل" عملی رواج ان کے نزدیک سنت کی ایک قسم ہے، جو دوسرے علاقوں کے عرف کو بھی قانونی حیثیت دینے کا ذریعہ بنتی ہے، یعنی امام مالک کے نزدیک عرف نہ صرف معتبر بلکہ بعض صورتوں میں فیصلہ کن دلیل ہے، مالکی فقہ کی سب سے نمایاں خصوصیت

"عمل اہل مدینہ" کو حجت ماننا ہے جیسا کہ ماقبل میں بیان ہوا تفصیل سے کہ مدینہ میں صحابہ کی اکثریت رہی وہاں کا عرف دراصل سنتِ عملی کا تسلسل ہے۔ اگر حدیث خبرِ واحد ہو اور مدینہ کا تعامل اس کے خلاف ہو تو مالکیہ تعامل کو ترجیح دیتے ہیں۔ مالکی فقہ میں عرف کا تعلق "مصالح مرسلہ" سے بھی ہے یعنی معاشرتی فائدہ اور عمومی مصلحت ہے

فقہی مسائل میں دونوں مکاتب کی تطبیقات کا تقابل

اگر ہم مسائل کا جائزہ لیں جیسا کہ اسکا مفصل تذکرہ ماقبل میں ذکر ہو چکا جیسا کہ :.بیع میں معاطاۃ اشارے سے.بیع کا اعتبار، اجارہ میں اجرت کا تعین، خیار الشرط کی مدت کا تعین، مہر کی مقدار کا تعین، طلاق کے الفاظ کی تفسیر وغیرہ تو ان مسائل میں تقابل موقف کے جاننے سے واضح ہو گا۔

حنفی موقف:

حنفیہ معاطاۃ صرف لے دے کر.بیع، بغیر الفاظ کے کو جائز اور نافذ مانتے ہیں، کیونکہ یہ لوگوں کا عرف ہے، امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"الْبيْعُ بالْمُعَاطَاةِ جَائزٌ عِنْدَنَا ، لِأَنَّ الْعُرْفَ الْجَارِي بيْنَ النَّاسِ فِي التَّعَامُلِ بذَلِكَ مُعْتَبرٌ"[44]

ترجمہ: "ہمارے نزدیک معاطاۃ سے.بیع جائز ہے، کیونکہ لوگوں کے درمیان اس پر رائج عرف معتبر ہے۔"

---

[44] :۔ السرخسی، محمد بن احمد۔ المبسوط جلد 13، ص۔12۔ بیروت: دار المعرفۃ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

بیع تعاطیSale by Conductسے مراد وہ خرید و فروخت ہے جس میں فریقین زبان سے ایجاب و قبول کے الفاظ ادا کرنے کے بجائے محض لین دین کے عمل سے سودا مکمل کر لیتے ہیں۔ فقہ حنفی میں بیع تعاطی کا تصور انسانی ضرورت اور عرفِ عام کی رعایت پر مبنی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے: فقہ حنفی کے نزدیک بیع کے انعقاد کے لیے اصل رکن "تراضي" یعنی فریقین کی باہمی رضامندی ہے۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ رضامندی الفاظ کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متبعین اور متاخرین فقہاء کے نزدیک فعل عمل بھی قول الفاظ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔

فقہ حنفی کا مشہور قاعدہ ہے:

"الْعِبرَةُ فِي الْعُقُودِ لِلْمَعَانِي لَا لِلْأَلْفَاظِ"عقود میں اعتبار مفہوم اور مقاصد کا ہوتا ہے، نہ کہ صرف ظاہری الفاظ کا۔ بیع تعاطی کے حوالے سے فقہ حنفی کا موقف نہایت واضح ہے کہ یہ ہر قسم کی اشیاء میں جاری ہو سکتی ہے، چاہے وہ معمولی قیمت کی ہوں یا قیمتی اشیاء۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ "رد المحتار" میں تحریر فرماتے ہیں: "تَنْعَقِدُ الْبَيْعُ بِالتَّعَاطِي فِي النَّفِيسِ وَالْخَسِيسِ". بیع تعاطی منعقد ہو جاتی ہے، چاہے چیز قیمتی ہو یا حقیر۔ [حوالہ: الدر المختار مع رد المحتار، کتاب البیوع]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص دکان سے کوئی چیز اٹھاتا ہے اور اس کی مقررہ قیمت دکاندار کو دے دیتا ہے اور دونوں خاموش رہتے ہیں، تو شرعی طور پر یہ بیع مکمل اور صحیح ہے۔ فقہ حنفی میں بیع تعاطی کے جواز کے لیے یہ شرط اہم ہے کہ فریقین کے درمیان ثمن قیمت متعین اور معلوم ہو۔ اگر قیمت معلوم ہو اور قرائن سے یہ واضح ہو کہ فریقین اس لین دین پر راضی ہیں، تو زبان سے "میں نے خریدا" یا "میں نے بیچا" کہنا ضروری نہیں رہتا۔ امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیع کا مقصد ملکیت کا تبادلہ ہے، اور جب فعل سے یہ مقصد حاصل ہو رہا ہو تو الفاظ کی قید لگانا لوگوں کے لیے بلاوجہ کی تنگی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی کا یہ منہج موجودہ دور کے جدید تجارتی نظام، جیسے سپر مارکیٹس اور خودکار مشینوں کے ذریعے ہونے والی خرید و فروخت کو ایک مکمل شرعی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ حنفی فقہاء کے نزدیک عرف اور عادت کی بنیاد پر ہونے والا یہ خاموش معاہدہ قانونی طور پر ویسا ہی نافذ العمل ہے جیسا کہ الفاظ کے ذریعے طے پانے والا سودا۔

حنفیہ کے نزدیک اگر اجرت عرف میں معروف ہو تو اسے صراحتاً ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"إِذَا كَانَتِ الْأُجْرَةُ مَعْرُوفَةً فِي الْعُرْفِ، قَامَتْ مَقَامَ الشَّرْطِ، وَيَصِحُّ الْعَقْدُ"[45]

فقہ حنفی کے نزدیک اجرت مزدوری یا کرایہ کا عرف میں معروف ہونا ایک ایسی مضبوط شرعی دلیل ہے جو غیر معین معاملے کو بھی قانونی حیثیت عطا کر دیتی ہے۔ حنفی فقہاء کے نزدیک اصل قاعدہ یہ ہے کہ اجرت کا پہلے سے طے ہونا ضروری ہے، لیکن اگر کسی معاملے میں اجرت صراحتاً طے نہ کی گئی ہو تو وہاں معاشرے کے عرف اور رواج کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ فقہ حنفی کا مشہور قانونی اصول ہے: "الْمَعْرُوفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ شَرْطًا" یعنی جو بات عرف میں معروف ہو، وہ ایسی ہی ہے جیسے اسے معاہدے میں شرط کے طور پر لکھ دیا گیا ہو۔

اس موقف کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مزدور کو کام پر رکھے یا کسی کی خدمات حاصل کرے اور اجرت کا تذکرہ نہ ہو، تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصولوں کے مطابق اسے "اجرِ مثل" اس کام کی بازاری مزدوری دی جائے گی۔ اس کی بنیاد یہ قاعدہ ہے: "الثَّابتُ بالْعُرْفِ كَالثَّابتِ بالنَّصِّ" عرف سے ثابت شدہ چیز نص سے ثابت شدہ کی طرح ہوتی ہے۔ حنفی فقہاء کے نزدیک اگر ایک درزی یا دھوبی کا کام کرنا معاشرے میں اجرت کے بدلے معروف ہے، تو محض اس کے کام کرنے سے اجرت واجب ہو جائے گی، چاہے زبان سے اجرت طے نہ ہوئی ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ "رد المحتار" میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے کام لیتا ہے جو اجرت پر کام کرنے کے لیے مشہور ہے جیسے کوئی پیشہ ور کاریگر، تو کام مکمل ہوتے ہی اس پر عرفی اجرت لازم ہو جائے گی۔ حنفیہ کا یہ منہج اس اصول پر قائم ہے کہ "التَّعْيِينُ بِالْعُرْفِ كَالتَّعْيِينِ بِالنَّصِّ" یعنی عرف کے ذریعے کسی چیز کا تعین کرنا ایسا ہی ہے جیسے شریعت نے خود اسے متعین کر دیا ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے خیار الشرط کی مدت عرفاً تین دن مقرر کی، امام سرخسی رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"قَالَ أَبو حَنِيفَةَ: خِيَارُ الشَّرْطِ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ بالْعُرْفِ، وَقَالَ أَبو يُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ: هُوَ مَا يَشْتَرِطَانِهِ"[46]

[45] :۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر۔ 1992۔ رد المحتار علی الدر المختار جلد 5، ص۔ 34۔ بیروت: دار الفکر۔

[46] :۔ السرخسی، محمد بن احمد۔ المبسوط جلد 14، ص۔ 23۔ بیروت: دار المعرفۃ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نزدیک اس مدت سے زیادہ کا خیار عقد کو باطل کر دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ مشہور حدیث نبوی ﷺ ہے: "أَنَّ النَّبِي ﷺ قَالَ لِحَبانَ بنِ مُنْقِذٍ: إِذَا بايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابةَ، وَلِي الْخِيَارُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ" یعنی نبی کریم ﷺ نے حبان بن منقذ سے فرمایا: جب تم سودا کرو تو کہو کہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے اور میرے لیے تین دن کا اختیار ہے۔

امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ بیع کا اصل مقتضیٰ ملکیت کی فوری منتقلی ہے، اور خیار اس کے خلاف ہے، لہٰذا اسے صرف اس حد تک قبول کیا جائے گا جتنی نص میں اجازت آئی ہے۔ اس کے برعکس امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ صاحبین کا موقف یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو تین دن سے زیادہ کی مدت کے لیے بھی خیارِ شرط رکھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ مدت متعین ہو۔ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ "الأَصْلُ فِي الشُّرُوطِ الصِحَّةُ مَا لَمْ يُخَالِفِ النَّصَّ" یعنی شرط میں اصل صحت ہے جب تک وہ نص کے صریح خلاف نہ ہو۔ ان کے نزدیک تین دن کی حدیث ایک مثال کے طور پر ہے، اور انسانی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں، لہٰذا اگر فریقین باہمی رضامندی سے ایک ماہ کا وقت بھی طے کر لیں تو وہ جائز ہے۔ متاخرین حنفی فقہاء نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ موجودہ دور کے پیچیدہ معاملات اور بڑی تجارتوں میں تین دن کی مدت جانچ پڑتال کے لیے ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ "رد المحتار" میں فرماتے ہیں: "وَالْفَتْوَى عَلَى قَوْلِ الصَّاحِبَيْنِ لِحَاجَةِ النَّاسِ" یعنی لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے کہ تین دن سے زیادہ کا خیار بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی میں امام اعظمؒ کا اصل موقف احتیاط اور نص کی ظاہری پیروی پر مبنی تھا، مگر فقہ کی لچک اور وسعت نے "عرف اور ضرورتِ عامہ" کو دیکھتے ہوئے صاحبین کے موقف کو قانونی طور پر معتبر قرار دیا، تاکہ خرید و فروخت میں کسی فریق کو نقصان نہ پہنچے۔

حنفیہ مہر کی مقدار کا تعین عرف کے مطابق کرتے ہیں، اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں، امام السرخسی رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"الْمَهْرُ يُقَدَّرُ بِالْعُرْفِ، فَمَا تَعَارَفَهُ النَّاسُ فِي كُلِّ بَلَدٍ هُوَ الْمُعْتَبَرُ"[47]

مہر کی کم از کم مقدار تو شرعی طور پر متعین ہے، لیکن مہر کی کل مقدار، اس کی نوعیت معجل یا مؤجل اور دیگر تفصیلات میں عرف و رواج کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حنفی فقہاء کے ہاں یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جہاں نکاح کے وقت مہر کی کوئی خاص مقدار یا ادائیگی کا طریقہ طے نہ کیا جائے، وہاں اس خاندان اور معاشرے کے رواج کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ مہر کی مقدار کے حوالے سے حنفیہ کا پہلا اصول "مہرِ مثل" کا ہے، یعنی اگر مہر طے نہ ہو تو عورت کو وہی مہر دیا جائے گا جو اس کے باپ کے خاندان کی اس جیسی خواتین بہنوں، پھوپھیوں کو دیا جاتا رہا ہو۔ اس کی بنیاد یہ فقہی قاعدہ ہے: "الْمَعْرُوفُ كَالْمَشْرُوطِ" کہ جو بات عرف میں معروف ہو، وہ ایسی ہی ہے جیسے نکاح نامے میں شرط کے طور پر لکھ دی گئی ہو۔ امام کاسانی رحمہ اللہ "بدائع الصنائع" میں فرماتے ہیں: "أَنَّ الْمَهْرَ يَجِب بالْعَقْدِ وَيَتَقَدَّرُ بمَهْرِ الْمِثْلِ عِنْدَ عَدَمِ التَّسْمِيَةِ" یعنی مہر عقدِ نکاح سے واجب ہو جاتا ہے اور نام طے نہ ہونے کی صورت میں اس کی مقدار مہرِ مثل عرفی مہر سے طے ہو گی۔

اسی طرح مہر کی ادائیگی کے وقت یعنی کتنا مہر فوراً دیا جائے گا اور کتنا بعد میں کے بارے میں بھی حنفیہ کا دار و مدار عرف پر ہے۔ اگر نکاح میں یہ واضح نہ ہو کہ مہر "معجل" فوری ہے یا "مؤجل" ادھار، تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس شہر کے رواج کو دیکھا جائے گا۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "يُنْظَرُ إِلَى الْعُرْفِ فِي كُلِّ بَلْدَةٍ" یعنی ہر شہر کے عرف کی طرف دیکھا جائے گا کہ وہاں کتنا حصہ فوری دینے کا رواج ہے۔

یہ اصول اس لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ میاں بیوی کے درمیان مالی معاملات میں نزاع نہ ہو اور عورت کا حق ضائع نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی میں مہر کے معاملات میں عرف کو ایک قانونی پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ حنفی فقہاء کے نزدیک معاشرتی رواج کو اس لیے مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ نکاح ایک سماجی تعلق ہے اور اس کے مالی پہلوؤں کو لوگوں کی عمومی عادات العرف کے مطابق حل کرنا ہی عدل اور سہولت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

حنفیہ نفقہ کی مقدار کا تعین عرف کے مطابق کرتے ہیں، امام السرخسی رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"النَّفَقَةُ تُقَدَّرُ بِالْعُرْفِ، فَمَا تَعَارَفَهُ النَّاسُ فِي كُلِّ بَلَدٍ هُوَ الْمُعْتَبَرُ"[48]

نفقہ کی مقدار طے کرنے میں شوہر اور بیوی دونوں کی مالی حالت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اگر دونوں امیر ہیں تو امراء والا نفقہ، اور اگر دونوں غریب ہیں تو غرباء والا نفقہ لازم ہو گا۔ لیکن اگر ایک امیر اور دوسرا غریب ہو، تو حنفیہ کے نزدیک "متوسط" درمیانہ نفقہ واجب ہو گا۔ اس کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

---

[47] :۔ ایضاً۔ جلد 5، ص۔ 178۔ بیروت: دار المعرفۃ۔

[48] :۔ ایضاً۔ جلد 5، ص۔ 212۔ بیروت: دار المعرفۃ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

"لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ"

ترجمہ: وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر رزق تنگ ہو وہ اس میں سے دے جو اللہ نے اسے دیا ہے

حنفی فقہاء کے نزدیک نفقہ کی کوئی مخصوص رقم یا مقدار شریعت نے طے نہیں کی، بلکہ اسے "کفایت "ضرورت پوری ہونے اور "عرف" پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ "ردالمحتار" میں فرماتے ہیں:

"الْمُعْتَبَرُ فِي النَّفَقَةِ قَدْرُ الْكِفَايَةِ بِحَسَبِ الْعُرْفِ" نفقہ میں اعتبار عرف کے مطابق ضرورت پوری ہونے کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانے، پینے، لباس اور رہائش کی وہ مقدار فراہم کرنا شوہر پر لازم ہے جو اس جیسے حالات والے لوگوں میں معروف ہو۔ نفقہ میں صرف کھانا پینا ہی نہیں بلکہ رہائش مسکن بھی شامل ہے، جس کے بارے میں حنفیہ کا موقف یہ ہے کہ شوہر بیوی کو ایسا علیحدہ کمرہ یا گھر فراہم کرے جہاں اس کی پرائیویسی برقرار رہے اور شوہر کے رشتہ داروں کی مداخلت نہ ہو۔

امام کاسانی رحمہ اللہ "بدائع الصنائع" میں لکھتے ہیں:

"يَجِب عَلَيْهِ أَنْ يُسْكِنَهَا فِي بيْتٍ خَالٍ عَنْ أَهْلِهِ" شوہر پر لازم ہے کہ وہ بیوی کو ایسے گھر میں رکھے جو اس کے گھر والوں سے خالی ہو۔ خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی میں نفقہ کی مقدار کا تعین ایک لچکدار عمل ہے جو شوہر کی استطاعت اور زمانے کے عرف پر منحصر ہے۔ جہاں شوہر نفقہ دینے سے عاجز ہو یا کوتاہی کرے، وہاں قاضی عرف اور حالات کو مدنظر رکھ کر نفقہ کی مقدار مقرر کر سکتا ہے تاکہ عورت کی بنیادی ضرورتیں وقار کے ساتھ پوری ہو سکیں۔

حنفیہ طلاق کے الفاظ کی تفسیر میں عرف کو معیار مانتے ہیں، امام ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ حنفی فرماتے ہیں:

"أَلْفَاظُ الطَّلَاقِ تُحْمَلُ عَلَى الْعُرْفِ، فَمَا تَعَارَفَهُ النَّاسُ طَلَاقًا يَقَعُ، وَمَا لَا يَتَعَارَفُونَ لَا يَقَعُ"[49]

فقہ حنفی میں طلاق کے الفاظ کی تعبیر اور ان سے مراد لینے کے معاملے میں عرف کو ایک بنیادی معیار تسلیم کیا گیا ہے، خاص طور پر ان الفاظ میں جو "کنایہ" غیر صریح ہوتے ہیں۔ حنفی فقہاء کے نزدیک طلاق کے معاملے میں الفاظ کی لغوی گہرائی کے بجائے یہ دیکھا جاتا ہے کہ معاشرے کے لوگ ان الفاظ کو کس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر حنفی فقہاء کے نزدیک اصل قاعدہ یہ ہے کہ طلاق کے وہ الفاظ جو عرف میں طلاق ہی کے لیے مشہور ہو چکے ہوں، وہ "صریح" کے حکم میں آجاتے ہیں، چاہے لغت کے اعتبار سے ان کے معنی کچھ اور ہی کیوں نہ ہوں۔ فقہ حنفی کا مشہور اصول ہے: "الْمُعْتَبَرُ فِي الْأَلْفَاظِ الْعُرْفُ" الفاظ میں اعتبار عرف کا ہوتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ "ردالمحتار" میں فرماتے ہیں: "أَنَّ صَرِيحَ كُلِّ لُغَةٍ مَا اشْتَهَرَ فِيهَا فِي اسْتِعْمَالِ الْعِبادِ بِحَيْثُ لَا يَفْهَمُونَ مِنْهُ غَيْرَ الطَّلَاقِ[50]" یعنی ہر زبان کا صریح لفظ وہ ہے جو لوگوں کے استعمال میں اس قدر مشہور ہو جائے کہ وہ اس سے طلاق کے علاوہ کچھ اور نہ سمجھیں۔

اس موقف کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں لفظ "چھوڑ دیا" یا "فارغ کر دیا" طلاق کے لیے ہی بولا جاتا ہو، تو حنفیہ کے نزدیک ان الفاظ سے طلاق صریح واقع ہو جائے گی اور اس میں نیت پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی، کیونکہ عرف نے ان کنایہ الفاظ کو صراحت کا درجہ دے دیا ہے۔ اس کے برعکس اگر الفاظ کنایہ ہوں اور عرف میں ان کا استعمال طلاق اور غیر طلاق دونوں کے لیے ہوتا ہو، تو وہاں نیت کا اعتبار کیا جائے گا یا پھر "حالتِ غضب" غصے کی حالت جیسے قرائن کو عرفی معیار بنایا جائے گا۔ حنفی فقہاء کے نزدیک "تَعْيِينُ الْمُرَادِ بِالْعُرْفِ" عرف کے ذریعے مراد کا تعین اس قدر اہم ہے کہ وہ طلاق کے الفاظ میں نیت کے دعوے کو بھی عرف کے تابع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کہے جو عرف میں طلاق کے لیے متعین ہیں اور پھر کہے کہ "میری نیت طلاق کی نہیں تھی"، تو قضاءً قانونی طور پر اس کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا قول عرفِ عام کے خلاف ہے۔ امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلام کی حقیقت وہی ہوتی ہے جو اہل عرف کے ہاں رائج ہو۔

خلاصہ یہ کہ فقہ حنفی میں طلاق کی تفسیر محض لغوی قواعد پر نہیں بلکہ سماجی اور لسانی عرف پر مبنی ہے۔ یہ منہج اس لیے اپنایا گیا ہے تاکہ لوگ طلاق جیسے حساس معاملے میں الفاظ کے ہیر پھیر سے کھیل نہ سکیں اور معاشرے میں رائج مفہوم کو قانونی تحفظ حاصل رہے۔

[49] :۔ ابن عابدین، محمد أمین بن عمر۔ ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3، ص۔ 245۔ بیروت: دار الفکر۔

[50] :۔ ابن عابدین، محمد أمین بن عمر۔ ردالمحتار علی الدر المختار جلد 3، ص۔ 2645۔ بیروت: دار الفکر۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

مالکی موقف:

مالکیہ بھی معاطاۃ کو جائز مانتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ مدینہ کے عمل پر مبنی ہے، امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ مالکی فرماتے ہیں:

"الْبيْعُ بالْمُعَاطَاةِ جَائزٌعِنْدَ مَالِكٍ، لِعَمَلِ أَهْلِ الْمَدِينَةِ بذَلِكَ، وَهُوَعُرْفٌ عَامٌّ مُسْتَفِيضٌ"[51]

ترجمہ:"مالک کے نزدیک معاطاۃ سے بیع جائز ہے، کیونکہ اہل مدینہ کا عمل اسی پر تھا، اور یہ ایک عام مشہور عرف ہے۔"

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بیعِ تعاطی کا جواز دراصل عملِ اہل مدینہ اور وہاں کے قدیم تجارتی عرف سے ماخوذ ہے، کیونکہ مدینہ منورہ وحی کا مرکز اور سنتِ نبوی ﷺ کا گہوارہ رہا ہے جہاں کے بازاروں میں صحابہ اور تابعین کے دور سے ہی بہت سے معاملات بغیر زبان سے الفاظ ادا کیے محض لین دین کے ذریعے ہوتے چلے آ رہے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اہل مدینہ کا یہ تواترِ عملی اس بات کی ٹھوس دلیل ہے کہ شریعت نے بیع کے لیے رضامندی کو بنیاد بنایا ہے نہ کہ محض مخصوص الفاظ کی قید کو، اس لیے ان کے ہاں یہ اصول پختہ ہے کہ

"كُلُّ مَا يَعُدُّهُ النَّاسُ بيْعًا فَهُوَ بيْعٌ"یعنی ہر وہ عمل جسے لوگ اپنے عرف میں بیع شمار کریں وہ شرعی طور پر بیع ہی تسلیم کیا جائے گا۔ عملِ اہل مدینہ کی روشنی میں امام مالک رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ بیع دراصل ایک "معاملہ" ہے نہ کہ صرف "کلام"، لہذا جب خریدار قیمت رکھ دیتا ہے اور بیچنے والا چیز حوالے کر دیتا ہے تو یہ خاموش عمل ایجاب و قبول کے قائم مقام ہے کیونکہ مدینہ کے فقہاء اور عام لوگوں کے ہاں اسے رضامندی کی قطعی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک "الْمُعْتَبَرُ فِي الْبيْعِ مَا دَلَّ عَلَى الرِّضا"یعنی بیع میں اصل اعتبار اس چیز کا ہے جو فریقین کی خوشی پر دلالت کرے، چاہے وہ قول کی صورت میں ہو یا فعل کی صورت میں، اور چونکہ اہل مدینہ نسل در نسل اسی طریقے پر لین دین کرتے آئے ہیں، اس لیے اسے سنتِ قائمہ کا درجہ حاصل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیع کے لیے مخصوص عربی الفاظ کو لازم قرار دیا جائے تو یہ لوگوں کے لیے بلاوجہ کی تنگی پیدا کرنے کے مترادف ہو گا جو کہ شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، اسی لیے مالکیہ کے ہاں یہ اصول رائج ہوا کہ معاہدوں میں اصل توجہ مقاصد اور معانی پر دی جاتی ہے نہ کہ الفاظ اور ان کی ظاہری ساخت پر۔ ان کے نزدیک جب تک دھوکہ نہ ہو اور مبیع و ثمن معلوم ہوں، محض زبان کا خاموش رہنا عقد کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ عملِ اہل مدینہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ باہمی اعتماد اور عملی رضامندی ہی تجارت کی اصل روح ہے۔ مالکیہ کے نزدیک خیار الشرط کی مدت وہ ہے جو دونوں فریقین شرط کریں، اور عرف کو اس میں کوئی حد مقرر نہیں ہے، امام ابن رشد الحفید رحمہ اللہ علیہ مالکی فرماتے ہیں:

"الْمَالِكِيَّةُ يَرَوْنَ أَنَّ خِيَارَالشَّرْطِ إِنَّمَا هُوَ بحَسَب مَا يَشْتَرِطَانِهِ، وَلَا حَدَّ لَهُ بالْعُرْفِ"[52]

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خیارِ شرط معاہدہ منسوخ کرنے کا اختیاری حق کا تصور محض ایک قانونی ضابطہ نہیں بلکہ یہ لوگوں کی ضرورت اور مصلحت کی رعایت پر مبنی ہے، جس کی تائید عملِ اہل مدینہ سے ہوتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خیارِ شرط کی کوئی ایک مخصوص مدت جیسے تین دن شرعی طور پر متعین نہیں ہے، بلکہ اس کا دارومدار اس چیز کی نوعیت اور اس کی جانچ پڑتال کے لیے درکار وقت پر ہے جس کے لیے عرف و رواج کو معیار بنایا جائے گا۔

فقہ مالکی کا یہ امتیاز ہے کہ یہاں خیار کی مدت مبیع فروخت شدہ چیز کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے؛ مثلاً اگر کوئی شخص کپڑا خریدتا ہے تو اس کے لیے ایک یا دو دن کا خیار کافی ہو سکتا ہے، لیکن اگر مکان یا زمین کا معاملہ ہو تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایک ماہ یا اس سے زائد کا خیار بھی جائز ہے، کیونکہ اتنی بڑی چیز کی جانچ پڑتال کے لیے عرفاً زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اصل قاعدہ یہ ہے کہ خیار کی مدت اتنی ہونی چاہیے جس میں خریدار اپنی ضرورت کے مطابق چیز کو پرکھ سکے، جیسا کہ علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"مَدَدُ الْخِيَارِ مُقَدَّرَةٌ بقَدْرِ مَا يُحْتَاجُ إِلَيْهِ فِي الِاخْتِبارِ "یعنی خیار کی مدت کا اندازہ اس وقت سے لگایا جائے گا جس کی ضرورت چیز کی جانچ پڑتال کے لیے ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی ایسی مدت طے کر لی جائے جو اس چیز کی جانچ کے لیے عرفی ضرورت سے بہت زیادہ ہو، تو ایسا خیار جائز نہیں ہو گا کیونکہ یہ بیع میں غرر بے یقینی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ان کے نزدیک عملِ اہل مدینہ کا تقاضا یہ ہے کہ معاملات میں عدل قائم رہے، اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ خیار کی مدت میں اگر چیز ہلاک ہو جائے تو اس کا نقصان اس فریق پر ہو گا جس کے قبضے میں وہ چیز موجود ہے، بشرطیکہ وہ فریق اس ہلاکت کا سبب بنا ہو۔ خلاصہ یہ کہ امام مالک رحمہ اللہ

[51] :۔ ابن رشد، محمد بن أحمد۔ المقدمات الممهدات جلد 3، ص۔ 44۔ بیروت: دار الغرب الإسلامي۔

[52] :۔ ایضا، المقدمات الممهدات جلد 2، ص۔ 167۔ بیروت: دار الغرب الإسلامي۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

کے نزدیک خیارِ شرط کا دورانیہ لچکدار ہے اور اس کا پورا انحصار "حاجتِ ناس" لوگوں کی ضرورت اور "عرفِ عام" پر ہے۔ ان کے فقہی منہج کے مطابق شریعت کا مقصد بندوں کے معاملات میں آسانی پیدا کرنا ہے، اسی لیے انہوں نے کسی ایک مخصوص نص جیسے تین دن والی حدیث کو تمام اشیاء پر سختی سے نافذ کرنے کے بجائے ہر چیز کے اپنے عرفی تقاضوں کو مد نظر رکھا ہے۔

مالکیہ بھی مہر کا تعین عرف کے مطابق کرتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک مہر کی کوئی حد کم از کم ہے، امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ مالکی فرماتے ہیں: "الْمَهْرُ عِنْدَ مَالِكٍ يُقَدَّرُ بالْعُرْفِ، وَلَكِنَّ لَهُ أَدْنَى حَدٍّ هُوَ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ"[53]

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مہر کا تعین جہاں ایک طرف شرعی حدود کے تابع ہے، وہیں اس کی تفصیلات اور مقدار کے معاملے میں معاشرتی عرف اور مصلحت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مالکیہ کے ہاں مہر کی کم از کم مقدار نصاب مہر تین درہم یا اس کے برابر مالیت طے ہے، جس کی بنیاد وہ اس فقہی قیاس پر رکھتے ہیں کہ جس طرح چوری کی سزا قطع ید کے لیے کم از کم تین درہم کا نصاب ہے، اسی طرح نکاح جیسے مقدس اور اہم معاملے میں مہر کی کم از کم مقدار بھی اتنی ہونی چاہیے تا کہ نکاح کی اہمیت واضح ہو۔ اگر نکاح کے وقت مہر کی مقدار طے نہ کی جائے، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عورت "مہرِ مثل" کی حقدار ہوتی ہے، جس کا تعین مکمل طور پر عرف و رواج کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مہرِ مثل سے مراد وہ مہر ہے جو اس جیسی دوسری خواتین کو ان کے خاندان اور معاشرے میں دیا جاتا رہا ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کے فقہی منہج میں "تساوي" برابری کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ مہر کی مقدار طے کرتے وقت عورت کی خوبصورتي، مالداري، عقل، دینداری اور اس کے خاندان کے عرفی معیار کو دیکھا جائے گا، کیونکہ ان کے نزدیک نکاح کے مالی معاملات میں لوگوں کے درمیان رائج طریقہ کار ہی عدل کی اصل بنیاد ہے۔ اسی طرح مہر کی ادائیگی کے حوالے سے، یعنی کتنا مہر "معجل" فوری ہو گا اور کتنا "مؤجل" ادھار، امام مالک رحمہ اللہ اسے مکمل طور پر اس علاقے کے عرف پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر نکاح کے وقت ادائیگی کی تفصیل طے نہ ہو، تو وہاں کے رواج کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر کسی شہر میں آدھا مہر فوری دینے کا رواج ہے تو وہی واجب ہو گا، اور اگر پورے مہر کو ادھار رکھنے کا عرف ہے تو اسے تسلیم کیا جائے گا۔ یہ لچک اس لیے رکھی گئی ہے تا کہ نکاح جیسے سماجی بندھن میں مالی نزاعات کی وجہ سے تنگی پیدا نہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مہر محض ایک قیمت نہیں بلکہ ایک شرعی حق ہے، لیکن اس کی عملی صورت گری میں وہ اہل مدینہ کے اسلوب اور معاشرتی توازن کو مقدم رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرف کا اعتبار اس لیے ضروری ہے کیونکہ شریعت نے مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں کی، لہذا معاشرے کا رواج ہی وہ واحد پیمانہ ہے جو فریقین کے درمیان مصلحت اور برابری کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

مالکیہ بھی نفقہ کی مقدار کا تعین عرف کے مطابق کرتے ہیں، لیکن وہ شوہر کی حیثیت اور بیوی کی ضرورت کو بھی مد نظر رکھتے ہیں، امام ابن رشد الجد رحمہ اللہ علیہ مالکی فرماتے ہیں:

"النَّفَقَةُ عِنْدَ مَالِكٍ تُقَدَّرُ بالْعُرْفِ، مَعَ مُرَاعَاةِ حَالِ الزَّوْجِ وَحَالِ الزَّوْجَةِ"[54]

مالکیہ بھی طلاق کے الفاظ کی تفسیر میں عرف کو معیار مانتے ہیں، لیکن وہ عرف کے ساتھ ساتھ نیت کو بھی اہمیت دیتے ہیں، امام قرطبی رحمہ اللہ علیہ مالکی فرماتے ہیں:

"أَلْفَاظُ الطَّلَاقِ تُحْمَلُ عَلَى الْعُرْفِ وَالنِّيَّةِ مَعًا، فَإِنْ تَوَاطَأَ الْعُرْفُ وَالنِّيَّةُ وَقَعَ، وَإِلَّا فَلَا"[55]

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک طلاق کے الفاظ کی تفسیر میں عرف کے ساتھ ساتھ نیت ارادہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ مالکیہ کے ہاں یہ اصول نہایت پختہ ہے کہ "الاعتبار في العقود والایمان بالمقاصد" معاہدوں اور قسموں میں اصل اعتبار مقاصد کا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نیت وہ پیمانہ ہے جو کلام کے رخ اور اس کے شرعی اثر کا تعین کرتی ہے، خاص طور پر ان الفاظ میں جن میں طلاق کے علاوہ دیگر معنی کا احتمال پایا جاتا ہو۔ مالکیہ کے موقف کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص طلاق کے لیے "کنایہ" غیر صریح الفاظ استعمال کرتا ہے، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نیت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اگر شوہر کہے کہ "تم چلی جاؤ" یا "تم آزاد ہو"، تو اس سے طلاق تبھی ہو گی جب اس کی نیت طلاق کی ہو۔ لیکن یہاں امام مالک رحمہ اللہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نیت کو محض ایک قلبی دعویٰ کے طور پر نہیں چھوڑتے، بلکہ وہ نیت کو "عرفی قرائن" اور "حالت" کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑا یا طلاق کا تذکرہ ہو رہا ہو حالتِ غضب، تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ عرفی

[53] ۔ ابن رشد، محمد بن أحمد۔ المقدمات الممهدات جلد 2، ص۔ 234۔ بیروت: دار الغرب الإسلامي۔

[54] ۔ ایضا۔ المقدمات الممهدات جلد 2، ص۔ 278۔ بیروت: دار الغرب الإسلامي۔

[55] ۔ القرطبی، محمد بن أحمد۔ الجامع لأحکام القرآن جلد 5، ص۔ 113۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

قرینہ اس کی نیتِ طلاق پر دلالت کرے گا، اور پھر اس کی نیتِ غیر کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نیت طلاق کی تعداد ایک یا تین متعین کرنے میں بھی فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص نے طلاق کا ایسا لفظ استعمال کیا جس سے عرف میں ایک یا تین دونوں کا احتمال ہو، تو اس سے اتنی ہی طلاقیں واقع ہوں گی جتنی کی اس نے نیت کی تھی۔ تاہم، اگر عرف میں وہ لفظ صرف تین طلاقوں کے لیے ہی مخصوص ہو چکا ہو، تو پھر نیتِ واحد کا دعویٰ قضاءً قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ نیت کا عرف کے خلاف ہونا بعید از قیاس سمجھا جاتا ہے۔خلاصہ یہ کہ امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں طلاق کی تفسیر میں عرف اور نیت کا ایک گہرا توازن پایا جاتا ہے۔ عرف الفاظ کے مفہوم کی حدود متعین کرتا ہے، جبکہ نیت اس مفہوم کے اندر متکلم کے اصل مقصود کو واضح کرتی ہے۔ ان کے نزدیک نیت کا اعتبار اس لیے ضروری ہے تاکہ کسی شخص پر اس کی مراد کے بغیر کوئی شرعی حکم مسلط نہ ہو، لیکن اس نیت کو عرف کے معیار پر پرکھنا اس لیے ضروری ہے تاکہ طلاق جیسے معاملے میں کوئی شخص اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار نہ کر سکے۔

فقہ حنفی اور فقہ مالکی دونوں امت مسلمہ کے لیے رحمت ہیں۔ان کے مناہج میں فرق اختلافی نہیں بلکہ تنوعی ہے۔ عرف کے اعتبار میں دونوں مکاتب نے اپنے اپنے سیاق وسباق میں شریعت کی روح کو زندہ رکھا اور احکام کو لوگوں کی مصلحتوں کے مطابق ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔حنفیہ نے عرف کو قیاس پر مقدم کر کے معاملات میں لچک پیدا کی، جبکہ مالکیہ نے عمل اہل مدینہ اور مقاصد شریعہ کے ذریعے عرف کو نص کے قریب ترین مقام عطا کیا۔ دونوں نقطہ نظر اپنی جگہ پر قابل قدر ہیں اور آج بھی فقہی استنباط میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ کلام!

اس مقالہ میں جو فقہ حنفی اور فقہ مالکی کے درمیان عرف کے استعمال اور اس کی ترجیحی حیثیت کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ حنفی فقہاء کس طرح "استحسانِ عرفي" کو بروئے کار لا کر قیاس پر عرف کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ عوامی مشقت اور حرج کا ازالہ کیا جا سکے۔ دوسری جانب، فقہ مالکی کا وہ منفرد رنگ دکھایا گیا ہے جہاں "عملِ اہل مدینہ "جو کہ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے چلے آنے والے معاشرتی تسلسل کا نام ہے اور "مصالحِ مرسلہ " کے تناظر میں عرف کو معتبر مانا جاتا ہے۔ دونوں مکاتب فکر کے مناہج کا موازنہ کرتے ہوئے یہ عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرچہ دونوں کے طریقے جدا ہیں، مگر مقصود ایک ہی ہے:یعنی شریعت کے مقاصد کا تحفظ اور انسانی معاشرت میں آسانی پیدا کرنا۔ یہ باب جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے ایک روشن مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نتائج تحقیق

1. تحقیق سے واضح ہوا کہ عرف اسلامی فقہ کے اہم مصادرِ استنباط میں سے ایک معاون اصول ہے، جسے فقہِ حنفی اور فقہِ مالکی دونوں میں معتبر شرائط کے ساتھ حجت تسلیم کیا گیا ہے۔
2. فقہِ حنفی اور فقہِ مالکی دونوں مکاتبِ فکر میں عرف کی حجیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ قرآن، سنت اور اجماع کے کسی قطعی حکم سے متصادم نہ ہو اور معاشرے میں عمومی طور پر رائج و مستقر ہو۔
3. تحقیق سے معلوم ہوا کہ فقہِ مالکی میں عرف اور عملِ اہلِ مدینہ کو فقہی استدلال میں نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جبکہ فقہِ حنفی میں عرف کو قیاس، استحسان اور مصالح کے ساتھ مربوط انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔
4. دونوں فقہی مذاہب میں صحیح عرف کو عقود، معاملات، اجارات، وصایا، نکاح اور دیگر معاشرتی معاملات میں احکام کی تعیین اور تطبیق کا مؤثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔
5. تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا کہ متعدد مواقع پر عرف، مطلق نصوص کی تقیید، عام احکام کی تخصیص اور مجمل الفاظ کی تشریح میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، بشرطیکہ وہ شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔
6. فقہِ حنفی اور فقہِ مالکی دونوں میں عرف اور قیاس کے درمیان باہمی تعلق موجود ہے، تاہم بعض صورتوں میں معتبر عرف کو قیاسِ ظاہری پر ترجیح دی جاتی ہے تاکہ لوگوں کی ضروریات اور عملی مصالح کو بہتر طور پر پورا کیا جا سکے۔
7. عرف سے متعلق فقہی قواعد، جیسے "العادة محكمة "اور اس سے متعلق دیگر قواعد، دونوں مکاتبِ فکر میں فقہی مسائل کے حل اور اجتہادی تطبیقات کی مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

8. تحقیق سے معلوم ہوا کہ عرف کی تبدیلی کے ساتھ بعض اجتہادی اور فروعی احکام میں تبدیلی ممکن ہے، جبکہ قطعی شرعی احکام زمانے اور عرف کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتے۔

9. معاصر سماجی اور معاشی مسائل کے حل میں معتبر عرف کا استعمال اسلامی فقہ کی وسعت، لچک اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کو نمایاں کرتا ہے۔

10. مجموعی طور پر تحقیق یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ فقہِ حنفی اور فقہِ مالکی دونوں میں عرف کو ایک مؤثر فقہی دلیل کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، البتہ اس کی حجیت، دائرۂ کار اور عملی تطبیق میں بعض اصولی و منہجی اختلافات پائے جاتے ہیں، جو ہر مکتبِ فکر کے اصولِ استنباط کی خصوصیات کی عکاسی کرتے ہیں۔

مصادر و مراجع

1۔ ابنِ عابدین، محمد امین بن عمر۔ رد المحتار علی الدر المختار۔ بیروت: دار الفکر، 1992۔

2۔ ابنِ عابدین، محمد امین بن عمر۔ رد المحتار علی الدر المختار۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2003۔

3۔ ابنِ عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین۔ قاہرہ: المطبعۃ العامرۃ الشرفیہ، 1905۔

4۔ ابنِ عابدین، محمد امین بن عمر۔ مجموعہ رسائل ابن عابدین۔ لاہور: سہیل اکیڈمی، 1901۔

5۔ ابنِ رشد، ابو الولید محمد بن احمد۔ المقدمات الممہدات۔ بیروت: دار الغرب الاسلامی، 1988۔

6۔ ابنِ قدامہ، عبد اللہ بن احمد۔ المغنی۔ قاہرہ: مکتبۃ القاہرہ، 1968۔

7۔ ابنِ منظور، محمد بن مکرم۔ لسان العرب۔ بیروت: دار صادر، 1993۔

8۔ ابنِ نجیم، زین الدین بن ابراہیم۔ الأشباہ والنظائر علی مذہب أبی حنیفۃ النعمان۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1999۔

9۔ البزدوی، علی بن محمد۔ أصول البزدوی۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

10۔ سرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔ المبسوط۔ بیروت: دار المعرفہ، 1993۔

11۔ سرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد۔ المبسوط۔ قاہرہ: دار الحدیث، 2019۔

12۔ شاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ۔ الموافقات فی أصول الشریعۃ۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1997۔

13۔ شافعی، محمد بن ادریس۔ الأم۔ بیروت: دار المعرفہ، 1990۔

14۔ قرافی، ابو العباس احمد بن ادریس۔ الفروق (أنوار البروق فی أنواء الفروق)۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1994۔

15۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد۔ الجامع لأحکام القرآن۔ قاہرہ: دار الکتب المصریہ، 1964۔

16۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد۔ الجامع لأحکام القرآن۔ بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، 2006۔

17۔ کاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1986۔

18۔ مالک بن انس۔ الموطأ بشرح الزرقانی۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1985۔

19۔ مرغینانی، برہان الدین علی بن ابی بکر۔ الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی۔ کراچی: دار البشائر، 2008۔

20۔ قاسمی، محمد مصعب۔ شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کے حدود و قیود۔ دیوبند، بھارت: مکتبہ النور، 2016۔